# تیسرا حصہ

## اسلام کے آخری الہامِ الہیٰ ہونے کے دعویٰ کی منصفانہ تحقیق

## پہلا باب

### اس تحقیق کے سبب ووسعت کا بیان

ان اوراق کے معزز مطالعہ کرنے والوں کی خدمت میں عرض ہے کہ چند ہی سال کا ذکر ہے کہ ایک مسیحی سوداگر فارس کے مشہور شہر شیراز میں پہنچا۔ اس کا مال سوداگری ہر قیمت سے اعلیٰ وبالا تھا کیونکہ وہ مال کلام اللہ یعنی اہل الکتاب کی کتاب کی جلدوں کا انبار تھا۔ یہ کتابِ پاک وہی تھی جس پرخود قرآن ایسی بڑی شہادت دیتا ہے جس کا بیان ہم اس کتاب کے پہلے حصہ میں کرچکے ہیں توبھی نہایت حیرت کی بات ہے کہ جس اس سوداگر نے ان کتابوں کو فروخت کرنے کے لئے کھولا تو ملُالوگوں نے عوام الناس کو بھڑکایا۔ انہوں نے ان تمام کتابوں کو چھین کر پھاڑا اور پاؤں تلے روندا۔ سوداگر کو خوب زدوکوب کرکے شہر سے نکال دیا جیسا کہ انگورستان کے مالک کے چند نوکوں نے شریر باغبانوں نے سلوک کیا تھا(متی ۲۱: ۳۳، ۴۴)۔ اوراس کو یہ دھمکی دی کہ اگر ان کتابوں کو پھیلانے کے لئے واپس آؤگے تو قتل کئے جاؤں گے۔ یہ وہی کتبِ مقدسہ تھیں جن کے حق میں قرآن مسلمانوں کو یوں کہنے کا حکم دیتا ہے آمَنَّا بِاللّهِ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَقَ وَيَعْقُوبَ وَالأسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ یعنی ہم نے یقین کیا اللہ پر اور جو اتارا ہم پر اور جو اتارا (ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اوراس کی اولاد پراور جو ملاموسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملاسب نبیوں کو اپنے رب سے ۔ ہم فرق نہیں کرتے ایک میں ان سب سے اورہم اسی حکم پرہیں(سورہ بقرہ سولھواں رکوع آیت ۱۳۶)۔

اس ازدحام میں ایک فارسی لڑکا کھڑا تھا۔ جوکچھ وقوع میں آیا اس نے سب دیکھا اور وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ ان ملاؤں نے کیوں ایسی بے ادبی سے ان کتابوں کو برباد کرنے کے لئے عوام الناس کو بھڑکایا جنکی تصدیق وحفاظت[1] کے لئے آنے کا قرآن دعوی دار ہے۔ جب وہ اس امر پر سوچ رہا تھا اس کے ذہن میں یہ خیال آیا" کیا ممکن ہے کہ مسیحیوں کی ان کتابوں میں کوئی ایسی بات مندرج ہے جس سے ہمارے ملُاڈرتے ہوں اور وہ اسلام کو باطل ثابت کرتی ہے "؟ یہ لڑکا اس وقت تک اپنے دین پر بہت پختہ ایمان رکھتا تھا لیکن اس خیال سے بہت ہی دہشت زدہ ہوگیا۔ اس نے اس خیال کا بہت کچھ مقابلہ کیا۔ لیکن اس کو اپنے ذہن سے خارج نہ کرسکا۔آخر کار جب وہ جوان ہوا تو اس نے ان شکوک کو دور کرنے کی عرض سے اسلام کی صداقت کے اصلی ثبوت دریافت کرنے کا مصمم ارارہ کرلیا۔ان ایام میں شیراز کے پاس ایک نہایت معزز حاجی رہتا تھا جو اسلامی شریعت کا سخت پابند تھا۔ نماز پنجگانہ وتلاوتِ قرآن اور روزہای رمضان کی

[1] سورہ مائدہ آیت ۵۲

محافظت مواظبت میں مشہور تھا اور ہر ایک بات جو دیندار مسلمان کو کرنا چاہیے کرتا تھا۔ یہ نوجوان متفکر و محقق اس حاجی صاحب سے تعلیم پانے کو اس کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن جو کچھ وہ جاننا چاہتا تھا اس کے بارے میں کھلم کھلا سوال کرنے سے ڈرتا تھا۔ اس لئے مودبانہ سلام و تسلیمات اور مہذبانہ تامل کے بعد اس نے حاجی صاحب کی خدمت میں یوں عرض کی " آپ کے اس کمترین بندہ کو کل ایک یہودی سے ملاقات کا اتفاق ہوا اور اسے اپنے پاک دین میں داخل کرنے کی کوشش کی ۔ جو کچھ خاتم النبین حضرت محمد ﷺ کے بارے میں نیاز مند نے بیان کیا اس نے بغور سنا اور پھر کہنے لگا کہ ازراہِ عنایات بتائیے آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ حضرت محمد نبی تھے۔جناب نیاز مند سے جو جواب بن آیا اسے دیا لیکن اس یہودی کو قائل نہ کرسکا۔ اسی واسطے آپ کی خدمت میں بندہ حاضر ہوا کہ اس کے سامنے کونسے ثبوت پیش کرے" یہ سن کر حاجی صاحب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور اس جوان پر درشتی سے نظر کرکے فرمایا" تم کافر ہو"۔ وہ جوان نہایت خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگا اور تھوڑے ہی عرصہ میں بمبئی پہنچا اور جتنی جلدی اس سے ہوسکا اسی نے عہدِ جدید کسی سے عاریتہً لے کر اس کو بغور مطالعہ کیا تاکہ معلوم کرے کہ اس میں کونسی بات ہے جس نے ملاؤں کو لرزاں و ترساں کردیا اور ان کتابوں کو برباد کرنے پر آمادہ کیا۔

جس دین میں انسان نے تعلیم و تربیت پائی ہو اس کی صداقت کے بارے میں شک وشبہ کا ہونا شاید استثنای ندامت وپشیمانی ہر طرح کے عذاب سے بڑھ کر ہے۔ نیز شک انسان کو کمزور کرتا ہے اور اعتماد و ثوق کے ساتھ دینی فرائض کی بجاآوری سے روکتا ہے ۔ علاوہ بریں انسان کو آئندہ زندگی کی امید سے محروم کرکے شیطانی آزمائشوں کے سامنے آماجگاہ بنادیتا ہے لیکن خدا نے کچھ عرصہ کے لئے دنیا میں بہت سے مختلف مذاہب کو قائم رہنے دیا ہے تاکہ عقلمند اور سرگرم حقجو انسان یہ دریافت کرے کہ" میرے پاس اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ میرا دین ،دینِ حق ہے"؟ اگر کبھی کوئی اس قسم کا سوال نہ کرے تو کبھی کوئی بُت پرست فی الحقیقت مسلمان یا مسیحی نہیں ہوسکتا۔ لہذا صاف ظاہر ہے کہ اپنے دین وایمان کی بنیاد سچائی کے ساتھ جانچنا اچھی بات ہے کہ بشرطیکہ فروتنی اوراس آرزو کے ساتھ ہو کر انسان خداوند کریم کی مرضی کو دریافت کرکے عمل میں لائے کیونکہ جن کے دلوں میں یہ آرزو ہے وہ یقیناً ہمیشہ خدا سے دعاو مناجات کرینگے کہ وہ رحیم ورحمان ان کو نور وہدایت عنایت کرے تاکہ حق کو پہنچا کر نور کے فرزندوں کی طرح زندگی بسر کریں ۔ اگر ایسا آدمی اپنے دین کو سچا پاتا ہے تو وہ شک پر غالب آکر اس کو ہمیشہ کے لئے اپنے دل سے دور کردیتا ہے اور تہ دل سے خدا کی ہدایت ورحمت کا شکر بجالاتا ہے ۔علاوہ بریں حق کا عرفان حاصل کرکے وہ دیگر بنی آدم کو راہِ نجات کی تعلیم دیتا ہے لیکن اگر تحقیق کرنے سے اس کو یہ معلوم ہوجائے کہ اگرچہ اس کے دین میں بہت سی باتیں حق ہیں تو بھی اس کا دین دین حق نہیں ہے ۔ تو وہ اس موقع کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اپنی گمراہی سے آزاد ہو کر اس راہ راست کو اختیار کرے جو خدا اور ابدی زندگی کی طرف لے جاتی ہے۔ جن دلائل پر ہمارا ایمان قائم ہے دیانتداری کے ساتھ ان کی جانچ اور تحقیق کا نتیجہ بہر و صورت نیک ہے۔ اندیشہ اس امر کا ہے کہ مبادا لوگ اپنے شکوک کا مردانہ مقابلہ کرنے اور خدا پر توکل کرکے ان کی تحقیق کرنے کے عوض میں ان کے سامنے سے گریزاں ہوں۔ جو آدمی اپنے شکوک سے اس طرح بچنے کی کوشش کرتا ہے وہ ہمیشہ اس کا تعاقب کرتے ہیں اور بسا اوقات آخر کار اس کو مغلوب کرلیتے ہیں اور وہ دنیا میں بے خدا

ہو کر کفر کی حالت میں مرتا ہے ۔لیکن سچے طالب حق کے حق میں یہ مثل بالکل صادق ٹھہرتی ہے کہ من طلب شیئاً وجد وجد ومن قرع با با ولج ولج یعنی جو کوئی کسی چیز کوڈھونڈتا اور کوشش کرتا ہے اسے پالیتا ہے اور جو کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا اور استقلال دکھاتا ہے داخل ہوتا ہے۔

لہذا ہم اپنے مسلمان بھائیوں [1] کو دعوت دیتے ہیں کہ اپنے دین کی بنیاد کے ثبوت کی تحقیق میں ہمارے ساتھ شریک ہوں جیسا کہ اس کتاب کے پہلے دو حصوں میں مسیحی دین کی بنیاد کی تحقیق میں شریک رہے ہیں۔تمام ادیان کے محک امتحان اور معیار مقررہ کو اس مقام پر دوبارہ بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ جیسا ہم نے مسیحی دین کو جانچنے میں ان کا استعمال کیا ہے ویسا ہی اسلام کو پرکھنے میں کرنا ضروری ہے لیکن یہ ہم دل ہی دل میں کرینگے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی ہمارے الفاظ کو سخت کلامی ومحبت کی کمی پر محمول کرے۔

اسلامی کلمہ یا عقیدہ کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے میں لا الا اللہ کو یہود ونصاریٰ ایسی ہی سچائی اور صداقت سے مانتے ہیں جیسی صداقت سے خود مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا ذکر ہم پہلے بھی کئی بار کرآئے ہیں کہ خدا کی ہستی اور توحید کے ثبوت بہت سی کتابوں میں اور خدا کی مخلوقات میں پائے جاتے ہیں ۔ پس جو کچھ ہم سب بالا تفاق مانتے ہیں یہاں اس پر بحث کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اللہ جل جلالہ نے اپنے وجود اور اپنی توحید کو گھاس کی ایک ایک پتی سے ظاہر کیا ہے اور ہمارے ضمیر اور کائنات کی عجیب ترتیب وموافقت اور ہزارہا دیگر طریقوں سے منکشف فرمایا ہے۔

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۸۵

لیکن ہمارے اور ہماری تحقیق کا موجودہ مضمون ومبحث یہ ہے کہ کلمہ کے دوسرے حصے کی صداقت کا کیا ثبوت ہے ؟ یہ کیونکر ثابت ہوسکتا ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ہیں؟ مسلمان ان کی نبوت ورسالت ان کے من جانب اللہ ہونے پر کئی دلائل اور بہت سے ثبوت پیش کرتے ہیں ۔ ان میں سے بڑے بڑے ثبوت حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ یہ کہ عہدِ عتیق وجدید دونوں میں ان کے حق میں صاف پیشینگوئیاں مندرج ہیں۔

۲۔ یہ کہ قرآن کی زبان اور تعلیم نے نظیر وبےمثال ہیں اور اس طرح سے تنہا قرآن ہی حضرت محمد کے دعاوی کی سچائی اور صداقت کا کافی ثبوت ہے۔

۳۔ یہ کہ حضرت محمد کے معجزات خدا کی طرف سے ان کے دعاوی کی صداقت پر مہر ہیں ۔

۴۔ یہ کہ ان کی زندگی اور چال چلن ان کو آخری اور سب سے بڑا نبی ثابت کرتے ہیں۔

۵۔ یہ کہ اسلام کی سریع اشاعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی آدم کے لئے یہی خدا کا آخری الہام ہے۔

اب بے شک یہ مندرجہ بالا ثبوت یا دلائل نہایت قابلِ غور ہیں۔ اگر ان کی بنیاد صداقت پر ہے تو بیشک وہ حقیقت اسلام کو ثابت کرتے ہیں اور اس لئے تمام بنی آدم کو اسلام قبول کرنا واجب ولازم ہے لیکن اس سے پیشتر کہ ہم ان کی صداقت کے قائل ہوں ہمیں ان کو نہایت احتیاط وغور وفکر سے پرکھنا اور جانچنا ہے۔ سوداگر روپیہ لینے سے پیشتر کھرے کھوٹے کی تمیز کرتا

ہے اورہم کو اس سے بھی بڑھ کر ہوشیاری درکار ہے کیونکہ ہماری سعادتِ دارین کا دارومدار اس نتیجہ وفیصلہ پر ہے جس پر ہم اس تحقیق کے وسیلہ سے پہنچینگے کیونکہ سوال زیرِ بحث یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں دنیا کا نجات دہندہ کون ہے؟ سیدنا مسیح یا حضرت محمد؟ یہ لڑائی جھگڑے یا سخت کلامی کا مضمون نہیں ہے بلکہ اس کے متعلق ہم کو باادب وانصاف اور بے خوف ہو کر دعا ومناجات کےساتھ تحقیق کرنا ہے۔ مسیحی اور مسلمان دونوں اس تحقیق میں یکساں مشغول ہیں اور نتیجہ خدا کے جلال اوران کے فائدہ کا باعث ہوگا کیونکہ حق ہمیشہ تک پوشیدہ نہیں رہ سکتا بلکہ آخر کار آفتابِ نصف النہار سے بھی زیادہ آب وتاب کے ساتھ چمکتا ہے۔

آئندہ ابواب میں ہم اس تحقیق میں مشغول ہونگے اورجیسا مسیحیوں کو حکم ہے محبت کے ساتھ حق بات کہینگے (افسیوں ۴: ۱۵)۔ ہم ایسے طور پر لکھنے کی کوشش کرینگے کہ ہم دانستہ وقصداً کسی مسلمان بھائی کا دل نہ دکھائیں۔ لیکن اگر کوئی لفظ یا فقرہ مناسب معلوم ہو یا تہذیب وبرادرانہ محبت کے خلاف نظر آئے تو اس کے لئے ہم ابھی نہایت خلوصِ دل سے معذرت کرتے ہیں اورامید رکھتے ہیں کہ ان اوراق کے معزز پڑھنے والے یقین کرینگے کہ دیدہ ودانستہ ان کی دل آزاری نہیں ہوئی اورانسان خطا کار ہے جو خدایِ رحیم ورحمان پر ایمان لاتے ہیں ان سب کے لئے معاف کرنا نہایت زیبا ہے۔

# دوسرا باب

## کیا بائبل میں حضرت محمد کے حق میں پیشینگوئیاں مندرج ہیں؟

اس میں کلام نہیں کہ مسیح کی آمد کے متعلق عہدِ عتیق کے بہت سے مختلف مقامات پر پیشینگوئیاں مندرج تھیں۔ اس لئے اگر خدا کا ارادہ تھا کہ مسیح سے بہت بڑا نبی دنیا میں بھیجے توہم ضرور عہدِ عتیق وجدید دونوں میں اس آنے والے نبی کے حق میں پیشینگوئیاں دیکھنے کی امید کرینگے۔ پس اہلِ اسلام کے لئے یہ امر طبعی ہے کہ اپنے دین کے بانی کے حق میں پیشینگوئیاں تلاش کریں کیونکہ اگر حضرت محمد خاتم النبین تھے جن کی خاطر خدا نے کون ومکان کو پیدا کیا تو پھر اگر خدا اس امر کو بنی آدم سے پوشیدہ رکھتا اوران کو خبر نہ دیتا کہ آنے والے نبی کی آمد واطاعت کے لئے تیار ہوں تو نہایت ہی عجیب بات ہوتی۔ لہذا حضرت محمد کے مومنین ہم سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے حق میں نہایت صاف وصریح پیشینگوئیاں بائبل میں مندرج ہیں اگرچہ بعض اوقات وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ موجودہ پیشینگوئیاں کے علاوہ اور بھی تھیں لیکن ان کو یہود ونصاریٰ نے خارج کردیا۔

اس آخری جملہ پر بحث کرنے کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ پہلے حصہ میں ہم ثابت کرچکے ہیں کہ عہد عتیق وجدید ہمارے پاس اصل زبانوں میں اوراسی صورت میں موجود ہیں جس میں حضرت محمد کے ایام میں اور صدہا سال پیشتر موجود تھے۔ آنحضرت کے زمانہ میں یا ان سے بعد کے ایام میں ہر گز ہر گز

ان میں تحریف وتخریب نہیں ہوئی ۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم کو ایسی بے بنیاد باتوں سے کچھ اور واسطہ نہیں ہے لیکن اگرہماری موجودہ بائبل کے متن میں فی الحقیقت حضرت محمد کی آمد کے متعلق سچی پیشینگوئیاں موجودہیں توہم مسیحیوں کوواجب ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کریں۔ اس دلیل کے زور سے ہم محض یہ کہکر نہیں بچ سکتے کہ ایسی عبارات بعدمیں درج کردی گئی ہیں اوراگر یہ بات صاف ظاہر ہوجائے کہ جن عبارات کومسلمان بائبل سے پیش کرتے ہیں وہ حضرت محمد کے حق میں نہیں ہیں تومسلمان یہ نہیں کہہ سکتے کہ بائبل میں کسی وقت ایسی پیشنگوئیاں موجود تھیں لیکن تم اہلِ کتاب نے ان کو خارج کردیاہے۔

اس معاملہ میں بائبل کوپیش کرنے سے یہ نتیجہ نکلتاہے کہ جواس کو پیش کرتے ہیں اس سےایسی عبارات اقتباس کرتےہیں جوان کے خیال کے مطابق حضرت محمد کے حق میں ہیں وہ ایسا کرنے سے یہ تسلیم کرتےہیں کہ (۱) بائبل الہامِ الہیٰ ہے اور (۲) تحریف وتخریب سے محفوظ ہے ورنہ ایسی کتاب کوپیش کرنے سے کیافائدہ؟ اگرہمارے مسلمان بھائی ان دونوں باتوں کو تسلیم کرتےہیں توحضرت محمد کے حق میں بائبل کی مذکورہ پیشینگوئیوں کی تحقیق نہایت دلچسپ اورفائدہ بخش ہوسکتی ہے لیکن اگروہ ان دونوں باتوں کو نہیں مانتے تواپنے نبی کی نبوت اور رسالت کے ثبوت میں بائبل کوپیش کرنے سے ان کو کیا فائدہ ہے؟ بے شک صاحب علم اور وہ سب جنہوں نے اس معاملہ پر بغور سوچاہے ان دونوں حقیقتوں کو تسلیم کرتےہیں ۔ ہم کو یہ بھی امید ہے کہ جوکچھ ہم نے اس کتاب کےپہلے اور دوسرے حصہ میں بیان کیاہے اس کوہمارے معززپڑھنے والے کتبِ مقدسہ کی تعلیم کے مطابق خیال فرمائینگے۔

ہمارا بائبل کی عبارات کوایک دوسری کی مدد سے سمجھانا بیجا نہیں خیال کیا جائے گا۔ اصحاب فہم وفراست اس بات کو تسلیم کرینگے کہ شک اور مشکل کی حالت میں یا کسی آیت وعبارت کے معنوں کے باب میں اختلاف کے وقت درست طریق عمل یہی ہے اور نہ فقط بائبل بلکہ ہر کتاب کی تفہیم یونہی درستی کے ساتھ ہوتی ہے ۔ مبہم عبارات سادہ آیات کی مدد سے اکثر اوقات صاف ہوجاتی ہیں۔ اگر بعد کی عبارت کسی پیشتر کی پیشینگوئی کی تشریح کرے توبے تعصب صاحب علم کے لئے زیبا نہیں کہ الہام سے لکھنےوالے کی تشریح کوقبول نہ کرے اور یہ امید رکھے کہ ہم کوئی ایسی تاویل کریں جومتن کی عبارت کے مطابق نہیں اور کتاب کی اوربہت سی عبارات کی متناقض ہے۔

اب پہلے ہم عہدِ عتیق کی ان خاص خاص عبارات[1] کی تحقیق کریں گے جن میں ہمارے مسلمان بھی کہتے ہیں کہ حضرت محمد کے حق میں پیشینگوئیاں موجودہیں۔

۱ ۔ پیدائش کا ۴۹واں باب دسویں آیت ۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں حضرت محمد کا ذکرہے۔ خصوصاً اس لئے کہ آٹھویں آیت میں لفظ " یہوداہ" ایسے فعل سے مشتق ہے جس کے معنی" حمد" کرنے کے ہیں جیساکہ اسم محمد بھی اسی سے مشتق ہے۔لیکن عبارت سے صاف ظاہرہے کہ یہوداہ کی نسل سے شیلوہ پیدا ہونے والا تھا۔ حضرت محمد عرب کی قوم قریش میں سے تھے۔وہ

[1] جن عبارات پر یہاں بحث کی گئی ہے وہ اظہار الحق میں درج کی گئی ہیں اور الجات المجتدہین اور ہدایہ کی پانچ جلدوں میں اور دیگر مسیحی تصانیف میں ان کی تشریح کی گئی ہے۔

یہودی نہیں تھے لہذا آیت مندرجہ بالا میں ان کا ذکر مطلق نہیں ہے۔ علاوہ بریں حضرت محمد کی ولادت سے ۵۵۰ سال پیشتر بنی یہوداہ سے سلطنت جدا ہوچکی تھی۔ آٹھویں آیت کا فعل بمعنی تعریف عربی فعل حمد سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا ۔ یہودی تفاسیر سے اس امر کی تشریح ہوتی ہے کہ شیلوہ مسیح کا ایک لقب ہے اور سامری تارگمہ میں بھی یہی معنی مفہوم ہیں۔ سید نا مسیح بنی یہوادہ میں سے پیدا ہوا اور غیر اقوام بہت کچھ اس کی فرمانبردار ہوگئی ہیں۔

۲۔ استثنا کا ۱۸ واں باب ۱۵ ویں آیت اور ۱۸ ویں آیات۔ یہ کہا جاتا ہے نبی موعود بنی اسرائیل سے مبعوث ہونے والا نہیں تھا " تیرے ہی درمیان سے" آیت ۱۵ کا فقرہ سپٹا جنٹ اور سامری توریت میں نہیں ہے اور اعمال الرسل ۳: ۲۲ میں بھی نہیں پایا جاتا ) بلکہ " ان کے بھائیوں" بنی اسماعیل میں سے (پیدائش ۲۵: ۹، ۱۸ کو بھی دیکھو)اور کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے کوئی ایسا نبی پیدا نہیں ہوا(استثنا ۳۴: ۱۰ ) اور حضرت محمد بہت سی باتوں میں حضرت موسیٰ کی مانند تھے مثلاً دونوں نے دشمنوں کے گھروں میں پرورش پائی۔ بتُ پرستوں میں ظاہر ہوئے ۔ پہلے اپنے ہی لوگوں سے رد کئے گئے اور بعد میں ان کے مقبول ہوئے۔ دونوں نے شریعت دی ۔ دونوں اپنے دشمنوں سے بھاگے(حضرت موسیٰ مدیان کو اور حضرت محمد مدینہ کو جو ہم معنی نام ہیں)۔ دونوں نے اپنے دشمنوں پر لشکر کشی کی ۔ معجزے دکھائے اور اپنے تابعین کو اپنے بعد ملک فلسطین فتح کرنے کے قابل بنایا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ استثنا ۳۴: ۱۰ میں اسی زمانہ کا ذکر ہے جس میں یہ آیت تحریر ہوئی اور" اب تک" کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس سے یہ بات مراد تھی کہ ایسا نبی بنی اسرائیل میں پیدا ہوگا نہ بنی اسرائیل سے باہر۔ "تیرے ہی درمیان سے" کا فقرہ یقیناً اصل ہے اگرچہ اس کے بغیر بھی مطلب بالکل صاف ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ اسماعیل اسحاق کا سوتیلا بھائی تھا لیکن اگر بنی اسرائیل ۔بنی اسرائیل کے بھائی کہلا سکتے ہیں تو یقیناً بنی اسرائیل کے فرقے زیادہ صحت کے ساتھ ایک دوسرے کے بھائی کہلا سکتے ہیں(دیکھو سورۃ الاعراف کے گیارھویں رکوع کی پہلی آیت میں اخا ھمہ شعیاً۔ اسی کتاب استثنا میں بنی اسرائیل کے فرقے ایک دوسرے کے بھائی کہلاتے ہیں مثلاً دیکھو استثنا ۳: ۱۸، ۱۵: ۷ ، ۱۷: ۱۵، ۲۴: ۱۴)۔ سترھویں باب کی ۱۵ ویں آیت میں ٹھیک اسی قسم کا ایک جملہ مرقوم ہے" تو اپنے بھائیوں میں سے ایک کو اپنے اوپر بادشاہ مقرر کرنا"۔ یورپ کی سلطنتیں اگر سب نہیں تو ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جن پر بادشاہ حکمران ہیں جو ایسے خاندانوں میں سے ہیں جو اجنبی ہیں یا ابتدا میں اجنبی تھے لیکن بنی اسرائیل کی تمام تواریخ میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے اپنے اوپر کبھی کسی اجنبی کو بادشاہ مقرر کیا ہو۔ اگر ان کے بھائیوں میں سے " استثنا ۱۸: ۱۸ ) کی اسلامی تفسیر درست ہے تو چاہیے تھا کہ وہ اپنے بادشاہ مقرر کرنے کے لئے بنی اسماعیل میں جایا کرتے لیکن چونکہ وہ اپنی زبان کو خوب سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیا زمانہ حال کے مسلمانوں میں کوئی ایسا ہے کہ اگر اسے کہا جائے کہ کسی معقول نوکری کے لئے اپنے بھائیوں میں سے ایک کو بلاؤ تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کے اپنے خاندان کے لوگ مراد نہیں ہیں اور اسے کوئی ایسا آدمی تلاش کرنا ہے جس کے باپ دادا صدہا سال پیشتر اس کے باپ دادا کے رشتہ دار تھے؟ علاوہ بریں توریت میں صاف لکھا ہے کہ بنی اسماعیل سے کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا کیونکہ خدا کا عہد اسحاق کے ساتھ تھا نہ کہ اسماعیل کے ساتھ (پیدائش

۱۷: ۱۸، ۲۱، ۲۱: ۱۰-۱۲)۔ قرآن میں بھی کئی مقامات پر مرقوم ہے کہ نبوت اسحاق کی نسل کے سپرد ہوئی (سورہ عنکبوت آیت ۲۷ ، سورہ جاثیہ آیت ۱۵)۔ نبی موعود بنی اسرائیل کی طرف بھیجا جانے[1] کو تھا۔ لیکن حضرت محمد اہلِ عرب کی طرف بھیجے جانے کے دعویدار ہیں جن کے درمیان آپ پیدا ہوئے۔ حضرت موسیٰ سے مشابہت کے بارے میں ہم کو استثنا ۳۴: ۱۰-۱۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل آنے والے نبی میں حضرت موسیٰ کے ان دو اوصاف کے دیکھنے کے امیدوار تھے یعنی (۱) شخصی عرفان الہیٰ اور (۲) معجزات۔ ان میں سے شخصی عرفان کے بارے میں کیا حضرت محمد نے یہ نہیں کہا ماعرفناک حق معرفتک ؟ معجزات[2] کے بارے میں قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ حضرت محمد کو معجزات کی قدرت نہیں دی گئی (سورہ بنی اسرائیل آیت ۶۱ ، نیز دیکھو تفاسیر بیضاوی وعباسی۔ سورہ بقرہ آیت ۱۱۲ ، سورہ انعام آیات ۳۷، ۵۷، ۱۰۹ ، سورہ اعراف آیت ۲۰۲۔ سورہ یونس آیت ۲۱ ، سورہ رعد آیات ۸ ، ۳۰۔ سورہ عنکبوت آیت ۴۹، ۵۰)۔ حضرت موسیٰ وحضرت محمد میں باہمی مشابہت کی جو باتیں مسلمان پیش کرتے ہیں ان میں سے بہت سی مسلمہ اور رمانی میں پائی جاتی ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں

[1] یہ حاشیہ صفحہ ۱۰۳ سے متعلق ہے۔ اس سے اسلامی دلیل کی پوری پوری تردید ہوتی ہے ۔ دیکھو سورہ ۷ آیت ۶۳ اور ۷۱ اور ۸۳ میں علاوہ ثمود کی طرف حضرت ہود وصالح اور شعیب کے بھیجے جانے کا ذکر ہے۔ ان میں سے ہر ایک ان کا بھائی کہلاتا ہے اور جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے ان کو میری قوم کہتا ہے دیکھو سورہ ۷ آیت ۵۷، سورہ ۱۱ آیت ۳۷، ۳۰، ۵۲، ۶۴، ۸۵، سورہ ۲۶ آیت ۱۰۵ ، ۱۰۶ ، ۱۲۳ ، ۱۴۱ ، ۱۴۲ ، ۱۷۶ ، ۱۷۷۔

[2] حضرت موسیٰ کے معجزات قرآن میں مندرج ہیں (سورۃ الاعراف آیات ۱۰۱ سے ۱۱۶ تک اور ۱۶۰ ویں آیت)۔

ہوتا کہ وہ نبی تھے۔ علاوہ بریں خدا نے خود انجیل شریف میں صاف بتادیا ہے کہ یہ پیشینگوئی مسیح کے حق میں تھی نہ کہ حضرت محمد کے حق میں (استثنا ۱۸: ۱۵، ۱۹" تم اس کی طرف کان دھرنا وغیرہ کا متی ۱۷: ۵ سے مقابلہ کرو نیز دیکھو مرقس ۹: ۲ ، لوقا ۹: ۳۵)۔ سیدنا مسیح بتاتے ہیں کہ یہ اور توریت کی دوسری عبارات خود اسی کے حق میں ہیں (یوحنا ۵: ۴۶، کی نسل میں پیدا ہوا (متی ۱: ۱، ۱۶ لوقا ۳: ۲۳، ۳۸ عبرانیوں ۷: ۱۴)۔ اس کی پیدائش بن اسرائیل میں ہوئی اور قریباً اس کی تمام عمر یہودیوں میں گذری اور اس نے اپنے رسولوں کو سب سے پہلے یہودیوں ہی کے پاس بھیجا (متی ۱۰: ۶) اور اس کے بعد غیر اقوام کی طرف ( لوقا ۲۴: ۴۷، متی ۲۸: ۱۸-۲۰) اعمال الرسل ۳: ۲۵، ۲۶ میں یہ پیشینگوئی جس پر غور کر رہے ہیں نہایت صاف طور پر مسیح سے منسوب کی گئی ہے۔

۳۔ استثنا کے ۳۲ویں باب کی اکیسویں آیت میں یوں مرقوم ہے "انہوں نے اس کے سبب سے جو خدا نہیں مجھے غیرت دلائی اور اپنی واہیات باتوں سے مجھے غصہ دلایا"۔ ہم کو بتلایا جاتا ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہلِ عرب ہیں جن کی طرف حضرت محمد بھیجے گئے ۔ مسلمان کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یونانی نہیں ہوسکتے جو دانا اور عالم تھے جن کی طرف پولوس رسول اور مسیح کے دیگر رسول گئے۔ لیکن یہ آیت بالکل کسی نبی کی طرف اشارہ نہیں کرتی ۔ یہ اس امر کا بیان کرتی ہے کہ خدا کس طرح سے غیر اقوام کو بلائیگا۔ نہ فقط یونانیوں کو بلکہ اہل عرب اور انگریزوں اور تمام دیگر اقوام کو تاکہ سیدنا مسیح میں ایک ہی روحانی برادری میں شریک ہوں ۔ ۱ پطرس ۲: ۹، ۱۰ کی عبارت کا یہی مطلب ہے دیکھو افسیوں ۲: ۱۱، ۱۳ ، اہل یونان کی حکمت ودانائی کے

بارے میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ سچی حکمت نہ تھی کیونکہ یونانی خدای واحد وحی القیوم کا کچھ علم نہ رکھتے تھے اور حکمت کا آغاز اس ذاتِ باری تعالیٰ کی تعظیم میں ہے( زبور ۱۱۱: ۱۰ ،امثال ۱: ۷، ۹: ۱۰) اس جہان کی دانائی خدا کے نزدیک بیوقوفی ہے(۱کرنتھیوں ۳: ۱۹)۔

۴۔ استثنا کا ۳۳واں باب اوراسکی دوسری آیت۔ اس آیت میں "خداوند سیناسے آیا" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا مفہوم حضرت موسیٰ کو شریعت دینا ہے" اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا" سے انجیل کا نازل ہونا مراد ہے اور" فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا" میں قرآن عطا ہونے کے باب میں پیشینگوئی ہے کیونکہ کہتے ہیں کہ شہر مکہ کے پاس ایسے ہی نام کی ایک پہاڑی ہے۔ لیکن اس عبارت سے صاف عیاں ہے کہ حضرت موسیٰ نہ یہاں انجیل کا ذکر کررہا ہے نہ قرآن کا وہ بنی اسرائیل کو یاد دلارہا ہے کہ جب وہ کوہِ سینا کے قریب خیمہ زن تھے اس وقت انہوں نے اللہ جل شانہ کا جلال کس قدر صفائی سے دیکھا تھا۔ نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیناوشعیر وفاران[1] سینائی جزیرہ نما میں بالکل پاس پاس تین پہاڑ ہیں اورمکہ سے صدہا میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ یہ حقیقت دوسری عبارات سے جن میں فاران کا ذکر ہے اظہر من الشمس ہے (پیدائش ۱۴: ۶ گنتی ۱۰: ۱۲، ۱۲: ۱۵، ۱۳: ۳ استثنا ۱: ۱ ۱سلاطین ۱۱: ۱۸)۔

۵۔ ۴۵واں زبور حضرت محمد کے حق میں پیشنگوئی بیان کیا جاتا ہے کیونکہ وہ النبی بالسیف کہلاتے ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ زبور خصوصاً تیسری آیت سے پانچویں آیت تک ان کے حق میں صادق آتا ہے۔ لیکن اس کے دوجوابات ہیں جن میں سے ہرایک بجائِ خود اس خیال کی تردید کے لئے کافی ہے۔ اول یہ ہے کہ چھٹی آیت میں مرقوم ہے " تیرا تخت اے خدا الاآباد ہے" مسلمان کبھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ حضرت محمد خدا تھے۔ دوم یہ کہ عبرانیوں کے خط کے پہلے باب کی آٹھویں اور نویں آیت میں صاف بتایا گیا ہے کہ چھٹی آیت میں رویِ سخن سیدنا مسیح کی طرف ہے۔ تیرھویں آیت میں " شاہزادی" سے مسیح کی روحانی دلہن یعنی مسیحی کلیسیا مراد ہے (دیکھو مکاشفہ ۲۱: ۲)۔ اور شکست خوردہ دشمن شیطان وشیطان کے لشکر اور وہ لوگ جن کو شیطان نے مسیح کی انجیل کی مخالفت کے لئے برانگیختہ کیا ہے(مکاشفہ ۱۹: ۱۱- ۲۱)۔ مسیح کے حق میں اسی قسم کی اور پیشینگوئیاں ۲، ۷۲، ۱۱۰ویں زبور میں پائی جاتی ہیں۔ غالباً ابتدا میں اس زبور میں فرعون کی بیٹی کے ساتھ سلیمان کی شادی کا ذکر تھا(۱سلاطین ۳: ۱)اور یہ شادی مسیح اوراس کی کلیسیا (جماعت) میں روحانی یگانگی کی نظیر کے طور پر تصور کی گئی ہے۔

۶۔ ۱۴۵واں زبور بھی حضرت محمد کے حق میں پیشینگوئی گردانا گیا ہے ۔پہلی آیت میں " نیا گیت" قرآن بتایا گیا ہے اور چھٹی آیت میں " دودھاری تلوار" النبی بالسیف سے خاص مناسبت رکھتی ہے۔ حضرت علی کے پاس بھی ایک ایسی تلوار تھی جس کو وہ حضرت محمد کی خدمت میں استعمال کرتے تھے۔ لیکن مسلمان عبادت کے وقت گاتے بجاتے نہیں اور قرآن کسی طرح سے اور کسی صورت میں بھی " گیت " نہیں کہلاسکتا ۔ تلوار بادشاہ کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اسرائیل مردوں کے ہاتھ میں بیان کی گئی ہے اوراس کے وسیلہ سے وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لیتے تھے۔ دوسری آیت کے پہلے حصہ میں

[1] ایک پورا جواب الجات المجتہدین کے صفحہ ۱۸۴ اوراس کے بعد کے صفحات پر ملاحظہ کیجئے۔

"بادشاہ" سے خالق عالم مراد ہے اور چوتھی آیت میں وہ" خداوند" کہلاتا ہے۔ کسی صورت و معنی میں نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت محمد بنی اسرائیل کے بادشاہ تھے۔ اور اگر ہم اس بات کا خیال کریں کہ آنحضرت نے بنی النضیر و بنی ینقاع وبنی قریظہ اور دیگر یہودی جماعتوں کے ساتھ کیا کیا سلوک کئے تو ہم کو صاف معلوم ہوجائے گا کہ بنی اسرائیل بھی آپ سے کسی طرح سے خوش نہیں ہوسکتے تھے۔

۷۔ بعض مسلمان غزل الغزلات سلیمان کے پانچویں باب کی سولھویں آیت کو محض اسی بناپر حضرت محمد سے منسوب کرتے ہیں کہ عبرانی لفظ محمدیمہ بمعنی راحتہاجو کہ لفظ محمد کی طرح حمد سے مشتق ہے اس میں پایا جاتا ہے ۔ لیکن عبرانی زبان میں یہ لفظ اسم معرفہ نہیں بلکہ نکروہ ہے جیسے کہ اس آیت میں صیغہ جمع کے استعمال سے ظاہر ہے۔ یہی لفظ صیغہ جمع میں ہوسیع ۹: ۶، ۱۶، ۱ سلاطین ۲۰: ۶، نوحہ ۱: ۱۰، ۱۱، ۲: ۴ ویوایل ۴: ۵ ویسعیاہ ۶۴: ۱۰، ۲ تواریخ ۳۶: ۱۹ وحزقی ایل ۲۴: ۱۶، ۲۱-۲۵ میں استعمال کیا گیا ہے۔ حزقی ایل ۲۴: ۱۶ میں "تیری آنکھ کی پیاری" کا مفہوم ایک عورت ہے یعنی اس سے حزقی ایل کی زوجہ مراد ہے (دیکھو ۱۸ ویں آیت) اور پھر اس سے بُت پرست یہودیوں کے بیٹے بیٹیاں مراد ہیں(دیکھو آیت ۲۵ ویں) اگر غزل الغزلات میں اس لفظ کو حضرت محمد پر چسپاں کیا جاتا ہے تو ان دوسرے مقامات پر بھی انہیں چسپاں کرنا مناسب ہوگا۔ عربی زبان میں حمد سے بہت سے الفاظ مشتق ہیں لیکن محض اس بنا پر ان سب سے حضرت محمد مراد نہیں ہیں کوئی جاہل مسلمان یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ حضرت محمد کااسم مبارک سورہ فاتحہ میں موجود ہے کیونکہ الحمد اللہ رب العالمین میں لفظ حمد پایا جاتا ہے اور اسی طرح سے شاید کوئی ہندو یہ کہنے کی جرات کرے کہ رام یا اس کے کسی اور معبود کا نام قرآن میں موجود ہے کیونکہ سورۃ الروم میں یوں مرقوم ہے کہ غلبت الروم اور عربی لغت کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ روم رام سے مشتق ہے۔ اس قسم کی دلائل کو پیش کرنا ہر گز ہر گز اصحابِ علم وفہم کی شان کے شایاں نہیں ہے۔

۸۔ مسلمان کہتے ہیں کہ یسعیاہ ۲۱: ۷میں "گدھوں پر سوار" مسیح کے حق میں پیشینگوئی ہے جو کہ گدھے پر سوار ہو کر یروشلیم میں داخل ہوا تھا اور" اونٹوں پر سوار" سے حضرت محمد کی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ ہمیشہ اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ لیکن اگلی پچھلی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس باب میں نہ سیدنا مسیح کا ذکر ہے اور نہ حضرت محمد کا بلکہ جیسا کہ نویں آیت سے صاف ظاہر ہے یہ بابل کی بربادی کی پیشینگوئی ہے اور اس میں اس بات کا بیان ہے کہ کس طرح سے مسافر شہر کی اسیری اور اس کے بتوں کی تباہی کی خبر لائے۔ یہ سب کچھ دارا بادشاہ کے عہدِ حکومت میں پہلے ۵۱۹ سال قبل از مسیح اور پھر ۵۱۳ سال قبل از مسیح وقوع میں آیا۔

۹۔ اہلِ اسلام خیال کرتے ہیں کہ یسعیاہ ۴۲: ۱، ۴ میں حضرت محمد کے حق میں پیشینگوئی مندرج ہے۔ لیکن اگر ہم ابن ہشام، الطبری، ابن اثیر، کاتب الواقدی، روضۃ الصفا اور دیگر اسلامی مصنفین و تصانیف کے بیانات کو سچ مانیں تو مہربان و صلح جویِ آدمی کا بیان اس کے حق میں ہر گز ہر گز صادق نہیں آسکتا جو کہ النبی بالسیف کہلاتا ہے۔علاوہ بریں متی ۱۲: ۱۵تا ۲۱میں بصراحت بیان کیا گیا ہے کہ یہ پیشینگوئی سیدنا مسیح کے حق میں تھی اور اسی میں

پوری ہوئی۔ مسیحی دین بحرِ روم کے جزائر وسواحل کا دین ہے جو کہ چوتھی آیت میں مذکور ہیں۔

۱۰۔ پھراسی باب کی دسویں گیارھویں اور بارھویں آیت لفظ قیدار کو دیکھ کر بعض کہتے ہیں کہ اس لفظ سے اہلِ عرب مراد ہیں اوران کے اسلام لانے کی طرف اشارہ ہے لیکن دسویں آیت کا مندرجہ " نیا گیت " اسلام کا نیا طریق عبادت نہیں ہوسکتا کیونکہ اس میں گانے کی مطلق اجازت نہیں ہے۔" قیدار" بے شک قبائلِ عرب میں سے ایک قبیلہ کا نام تھا اس قبیلہ میں سے بہت سے (مثلاً بنی حمیرو بنی غسان وربیعہ ونجران وحیرہ وغیرہ) مسیحی ہوگئے تھے۔ اس کے بعد وہ مجبور کئے گئے تھے کہ یہ مسلمان ہوجائیں یا عرب سے نکل جائیں۔ یقیناً وہ پھر کبھی مسیحی ہوجائینگے۔ یہ آیات پہلی چار آیات کے بیان کے سلسلہ میں ہیں اوران کا اشارہ عرب میں مسیحی دین کی اشاعت کی طرف ہونا چاہیے جیسا کہ جزائر میں اشاعت کا ذکر کیا گیا ہے اوران کے درمیان بھی جن کو کہا گیا ہے " ای تم جو سمندر کی طرف جاتے ہو" (آیت ۲۰) پہلی آیت کے الفاظ " میرا بندہ" کا مفہوم ۴۹ویں باب کی تیسری آیت میں " اسرائیل " بتایا گیا ہے۔ اس سے یقیناً " خدا کا[1] اسرائیل " یعنی وہ لوگ مرادہیں جو مسیح پر ایمان رکھتے ہیں۔ " وہی بدن یعنی کلیسیا کا سر ہے" (کلسیوں ۱: ۱۸)۔اسی واسطے قدیم یہودی مفسرین یسعیاہ ۵۲: ۱۳ میں " میرا بندہ" کا مفہوم" مسیح موعود" بتاتے تھے۔سیدنا مسیح بنی اسرائیل سے پیدا ہوکر ان کا قائم مقام بنا لیکن حضرت محمد بنی اسرائیل سے خارج ہیں۔

[1] گلتیوں ۶: ۱۶

۱۱۔ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یسعیاہ کا ۵۳واں باب حضرت محمد کا ذکر کرتا ہے کیونکہ (۱)عرب میں پیدا ہونے کی وجہ سے وہ " خشک زمین سے پنپنے والی جڑ" تھے ۔(۲) اس کی قبر شریروں کے درمیان ٹھہرائی گئی کیونکہ آنحضرت مدینہ میں مدفون ہوئے۔(۳) یہ الفاظ کہ " وہ اپنی نسل کو دیکھیگا" آنحضرت کے حق میں پورے ہوئے ۔ (۴) آنحضرت نے "لوٹ کا مال زور آوروں یعنی انصار کے ساتھ بانٹ لیا" ۔(۵) آنحضرت نے اس جملہ کو پورا کیا" اس نے اپنی جان موت کے لئے انڈیل دی" کیونکہ آپ نے فی الحقیقت وفات پائی حالانکہ بہت سے مسلمان مسیح کی موت کے قائل نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ مسیح زندہ ہی آسمان پر چلا گیا۔ لیکن (۱)۵، ۶، ۷، ۸، آیات بالکل سیدنا مسیح کے سوا حضرت محمد یا کسی اور کے حق میں صادق نہیں آتیں۔ (۲) ۹ویں اور ۱۲ویں آیت کی نصفِ عبارت کسی طرح سے بھی حضرت محمد کے موافق حال نہیں ہے ۔(۳)لوٹ کا مال بانٹنے کی نسبت یہ کہنا کافی ہے کہ یہ موت کے بعد وقوع میں آنا تھا جو کہ روحانی معنوں میں سیدنا مسیح کے حق میں وقوع میں آیا کیونکہ اس کے جی اٹھنے اور آسمان پر چڑھ جانے کے بعد غیر اقوام اس کی سلطنت میں داخل ہونے لگیں لیکن اس کو حضرت محمد کے حق میں بالکل خیال نہیں کرسکتے۔(۴) یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اہلِ مکہ کی جگہ جنہو ں نے آنحضرت کو رد کیا اہلِ مدینہ یعنی انصار جنہوں نے آپ کو قبول کیا اور جو آپ کے لئے لڑے کیوں شریر قرار دئے جاتے ہیں۔(۵) اس پیشینگوئی کے تمام حصے روحانی طور پر سیدنا مسیح میں پورے ہوئے درحالیکہ بہت سے حصے کسی دورے کی طرف اشارہ نہیں کرتے اور حضرت محمد جیسے فتح مند جنگی مرد کا توان سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔ علاوہ بریں قدیم زمانہ کے یہودی، مفسرین اس باب کو

" مسیح موعود" کے حق میں پیشینگوئی اوراسی کی مانند بائیسویں زبور کی پیشینگوئی کس طرح سے فقط سیدنا مسیح ہی میں پوری ہوئیں۔

۱۲۔ یسعیاہ کے ۵۴ویں باب کی پہلی آیت کے بارے میں خیال کرتے ہیں کہ اس میں بنی اسماعیل سے حضرت محمد کی ولادت کی پیشینگوئی مندرج ہے۔ اس میں یہ بتایا گیاہے کہ اس قدر لوگ اس کی پیروی کرینگے اورخدا کی طرف رجوع لائینگے کہ تمام انبیایِ بنی اسرائیل کے وسیلہ سے بھی نہیں لائے تھے فی الحقیقت اس پیشینگوئی کے دو مطلب ہیں۔ ایک لفظی اورایک روحانی۔ لفظی مطلب یہ ہے کہ یہودی بابل کی اسیری سے آزاد ہو کر یروشلیم میں واپس پہنچینگے۔ یہ امر ۵۳۶ سال قبل از مسیح سے شروع ہو کر سائرس کے ایام میں وقوع میں آیا۔ روحانی مطلب پولوس رسول نے سکھایا ہے (گلتیوں ۴: ۲۱تا ۳۱)جہاں ہم اس پیشینگوئی کو پوری ہوتی دیکھتے ہیں جبکہ غیر اقوام جوکہ زمانہ ہای دراز سے بت پرستی میں غرق اور خدا سے دور تھیں سیدنا مسیح کی انجیل کو قبول کرنے لگیں۔ اتفاقاً پولوس نے اس عبارت میں بھی ذکر کیاہے کہ ھاجرہ کی اولاد کو سرہ کی اولاد پر ترجیح کا حق حاصل نہ تھا۔

۱۳۔ یسعیاہ ۶۳: ۱تا ۶ کے بارے میں اہلِ اسلام کہتے ہیں کہ ان آیات میں جس جنگی مرد کاذکر ہے وہ حضرت محمد ہیں کیونکہ وہ النبی بالسیف تھے۔وہ خیال کرتے تھے کہ پہلی آیت کا بصراہ مشور شہر بصرہ ہے لیکن پہلی آیت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ بصراہ ادوم میں ہے۔ آجکل یہ بصیرہ کہلاتا ہے اوربحر مردار سے جنوب کی طرف کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ اگر پانچویں آیت کا یسعیاہ ۵۹: ۱۵، ۱۶ سے مقابلہ کریں توروشن ہوجائیگا کہ وہ جنگ آزماخداوند رب الافواج خودہی جس نے ادوم کواس کے گناہوں کے لئے سزادی ہے۔یہی تشبیہی بیان مکاشفہ ۱۹: ۱۱، ۱۶ میں پایا جاتاہے جہاں پر جنگ آزما کامفہوم کلمة اللہ بتایا گیا ہے جو آخر کار بدکاروں کو سزا دیگا اور تمام دشمنوں کو زیر کریگا(۱کرنتھیوں ۱۵: ۲۵)۔

۱۴۔ یسعیاہ ۶۵: ۱تا ۶ کے باب میں کہا جاتاہے کہ یہ اہلِ عرب کے مسلمان ہونے کی پیشینگوئی ہے ۔ دوسری آیت اوراس کے بعد کی آیات میں یہود ونصاریٰ کے گناہ مذکور ہیں جن کے سبب سے خدا نے ان کورد کردیا۔ لیکن فی الحقیقت پہلی آیت بہت سے غیر اقوام کے مسیحی ہونے کی پیشینگوئی ہے۔ ۲تا ۶ تک بعض یہودیوں کے گناہوں کا ذکر ہے مگر ۸ سے ۱۰ آیت تک لکھاہے کہ آخر کار خدا قوم یہود کو رد نہیں کریگا(دیکھو رومیوں کا گیارہواں باب)۔ مسیحیوں کے حق میں کچھ نہیں کہا گیا اورآنحضرت کی نسبت ایک لفظ نہیں۔

۱۵۔ بعض مسلمانوں کی رای میں دانی ایل کے دوسرے باب کی ۴۵ویں آیت میں آغاز واشاعت اسلام کی پیشینگوئی مندرج ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس باب میں جن چار سلطنتوں کا ذکر ہے وہ یہ ہیں (۱)کسدی (۲) مادی(۳) کیانی(۴) یونانی۔ سکندرِ اعظم نے فارسی سلطنت کو تہ وبالا کرڈالا لیکن ساسانی بادشاہوں کے زیر سایہ اس میں پھر جان آگئی ۔ کبھی زور آور ہوجاتی تھی اور کبھی کمزور اور نوشیروان کے عہد حکومت میں حضرت محمد کی ولادت کے وقت تک قائم رہی۔ لیکن آنحضرت کی وفاتِ حسرت آیات کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اسلامی لشکروں نے سلطنتِ فارس کو زیروزبر کردیا اور فارس وفلسطین کو فتح کرلیا اور " تمام زمین پر پھیل گئے " (آیات ۴۴، ۴۵) لیکن یہ بیان تواریخی واقعات سے مطابقت نہیں رکھتا(۱) بابل کی سلطنت کے

بعد سلطنت کوئی مادی سلطنت تھی ہی نہیں۔(دارا مادی دانی ایل ۵: ۳۱، ۶ باب ۹: ۱)۔کے مطابق فقط کسدی مملکت پر بادشاہ مقرر کیا گیا یعنی بابل کی نواحی پر اس نے فقط ایک ہی سال کے کچھ حصہ تک حکومت کی۔ پھر خورس بادشاہ کا نائب مقرر ہوا) لہذا فارسی سلطنت دوسری سلطنت تھی (دانی ایل ۸: ۳، ۴، ۲۰)۔(۲) یونانی سلطنت تیسری سلطنت تھی(دانی ایل ۸: ۵، ۷، (۲۱)۔(۳) چوتھی سلطنت رومی تھی (دانی ایل ۲: ۴۰)۔جوان سب سلطنتوں میں بڑی تھی اورجس کا ذکر اسلامی تواریخی میں مطلق نہیں ہے(۴) وہ فارسی سلطنت جس میں ساسانی بادشاہوں کے زیر سایہ پھر جان آگئی پانچویں یا تیسری سلطنت شمار کی جاسکتی ہے لیکن چوتھی ہر گز نہیں ہوسکتی اور پیشینگوئی میں ان واقعات کا ذکر ہے جو چوتھی سلطنت کے ایام میں وقوع میں آئے (دانی ایل ۲: ۴۰، ۴۴، ۷: ۷، ۱۹)۔ یونانی سلطنت کے بارے میں جو کچھ مرقوم ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ چوتھی نہیں بلکہ تیسری سلطنت تھی کیونکہ فارسی سلطنت کا اسی نے خاتمہ کیا تھا(دانی ایل ۸: ۵، ۷، ۲۱)۔اور سکندر کی موت کے بعد چار حصوں میں منقسم ہوگئی تھی(دانی ایل ۸: ۸، ۲۲) اور اس طرح بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی اورآخرکار رومی سلطنت نے اس کو نگل لیا۔ سیدنا مسیح کی ولادت رومی سلطنت کے ایک حصہ میں وقوع میں آئی جبکہ قریباً تمام مہذب ممالک اس سلطنت میں شامل تھے۔ جو سلطنت سیدنا مسیح نے قائم کی وہ " دنیاوی" سلطنت نہیں تھی(یوحنا ۱۸: ۳۶، لوقا ۱: ۳۱، ۳۳، دانی ایل ۷: ۱۳، ۱۴، ۲۷) اوراس کی اشاعت تمام دنیاوی سلطنتوں کی طرح تلوار کے وسیلہ سے نہیں ہوئی۔ سیدنا مسیح نے اپنے آپ کو"ابن آدم " کہا اور اس طرح سے صاف ظاہر کردیا کہ دانی ایل ۷: ۱۳ میں اسی کا ذکر تھا۔ اسی کی سلطنت اس پتھر کی مانند بیان کی گئی ہے جس نے " تمام زمین کو بھر دیا" (دانی ایل ۲: ۴۵)۔جب وہ پھر آئیگا تو اسی کے سامنے سب لوگ گھٹنے ٹیکینگے(فلپیوں ۲: ۹تا ۱۱)۔

۱۶۔ حبقوق ۳:۳۔ مسلمان خیال کرتے ہیں کہ "وہ جو قدوس ہے کوہِ فاران سے آیا"۔ حضرت محمد کے حق میں ہے۔ لیکن اسی آیت کے باقی حصہ میں مرقوم ہے" اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہوئی" اس میں ضمیر واحد غائب سے صاف عیاں ہے کہ " قدوس" سے خود خداوند کریم مراد ہے جو آیت کے شروع ہی میں مذکور ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کوہِ فاران نواحی مکہ میں کہیں نہیں بلکہ سینائی جزیرہ نما میں واقع ہے۔ تیمان ادوم کا ایک ضلع اور قصبہ تھا اس نام کا ایک قصبہ یریحو سے جنوب کی جانب سلع کے قریب چند روز کی راہ پر واقع تھا۔ لہذا کوہِ فاران اور تیمان پاس پاس تھے اور دونوں مکہ سے شمال کی طرف اور صدہا میل کے فاصلہ پر یروشلیم سے بہت نزدیک تھے۔ یہ حقیقت کہ تیمان ادومیوں کے باپ عیسو کی نسل سے بیان کیا گیا ہے (پیدائش ۳۶: ۱۱، ۱۹)۔مورخین وجغرافیہ دان دوالیان ملک اور انبیاء کے بیانات کو جو ہم کو اس نام کے قصبہ کی جایِ وقوع کے بارے میں ملتے ہیں (یرمیاہ ۴۹: ۷، ۲۰، حزقی ایل ۲۵: ۱۳، عاموس ۱: ۱۱، ۱۲، عبدیاہ کی ۸، ۹، ۱۰ آیت) سچے ثابت کرتی ہے۔ اگر اب بھی علمائے اسلام اصرار کریں اور کہیں کہ تیمان کسی نہ کسی طرح سے اسلام سے تعلق رکھتا ہے تو ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ عبدیاہ کی کتاب میں سے پڑھ کر دیکھیں کہ خدا نے اس کو نیست ونابود کرنے کی کیسی دھمکی دی ہے۔

لیکن ہم مسیحی لوگ اس پیشینگوئی کو اسلام سے منسوب نہیں کرتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تیمان کا اسلام سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔

۱۷۔ حجی ۲: ۷ کے بارے میں مسلمان کہتے ہیں کہ "تمام اقوام کی مرغوب" سے حضرت محمد مراد ہیں کیونکہ عبرانی لفظ (حمداہ) بمعنی رغبت اسی اصل سے مشتق ہے جس سے لفظ "محمد" مشتق ہے۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ عربی زبان میں بھی وہ تمام الفاظ جو حمد سے مشتق ہیں ان میں سے ہر ایک کا مفہوم حضرت محمد نہیں ہیں۔ لہذا تمام ایسے عبرانی الفاظ کے باب میں یہ دعویٰ کیونکر قابلِ سماعت ہوسکتا ہے۔ یہی لفظ حمداہ دانی ایل ۱۱: ۳۷ میں استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ یوں مرقوم ہے " عورتوں کی مرغوبہ " اور اس مقام پر اس کے معنی غالباً جھوٹے معبود کے ہیں۔لہذا ہم لفظ کے کسی صیغہ پر ہی دلیل کو قائم نہیں کرسکتے اور یہ بھی ثابت نہیں ہوسکتا کہ اقوام عالم حضرت محمد کی آمد کی آرزو مند تھیں کیونکہ اسلام کی فتوحات بہت سی مفتوحہ اقوام کی مرغوبہ نہ تھیں۔ ہاں اہلِ عرب بیشک ایسی فتوحات کے بہت آرزومند تھے۔" تمام اقوام کی مرغوب" کے دو مختلف معنی ہوسکتے ہیں (۱) تمام اقوام کی مرغوبہ چیزیں" یعنی آٹھویں آیت کا مندرجہ زور سیم اور (۲)تمام غیر اقوام کی پسندیدہ چیز" یعنی "فضل سے برگزیدگی" (رومیوں ۱۱: ۵) جو ان میں سے ہوئی یعنی مسیحی کلیسیا یا(۳) خود سیدنا مسیح جو اپنی ہیکل میں آئے اوریروشلیم میں اپنے کفارہ کے وسیلہ سے اپنے لوگوں کو اس نے سلامتی بخشی(حجی ۲: ۹، ملاکی ۳: ۳، متی ۱۲: ۶، ۴۱، ۴۲، لوقا ۲۴: ۳۶۔ یوحنا ۱۴: ۲۷،۱۶: ۳۳، ۲۰: ۱۹، ۲۱، ۲۶)۔

شیعہ لوگوں نے اپنے خیالات وعقائد کی تائید میں عہدِ عتیق کی چند عبارات سے دلائل قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ اس میں سُنی ان سے متفق نہیں ہیں تو بھی ان کے دلائل کو دیکھنا مناسب ہوگا کیونکہ وہ بھی ایسے ہی مضبوط یا کمزور ہیں جیسے کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔

۱۸۔ پیدائش ۱۷: ۲۰ میں مرقوم ہے" اس سے بارہ سردار پیدا ہونگے۔" شیعہ کہتے ہیں کہ یہ بارہ اماموں کے حق میں پیشینگوئی ہے۔ شیعہ لوگوں کے نزدیک بارہ امام حضرت محمد کے جائز جانشین ہیں۔اس کے جواب میں ہم کو کچھ بھی نہیں کہنا۔ فقط پیدائش ۲۵: ۱۳، ۱۶ کی طرف توجہ دلانا ہے۔ ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ پیشینگوئی اسماعیل کے بارہ بیٹوں کے حق میں تھی جن کے نام ان آیات میں مندرج ہیں جن کو صاف طور سے " بارہ سردار لکھاہے"۔

۱۹۔ یرمیاہ ۴۶: ۱۰ میں مندرج ہے" خداوند رب الافواج کے لئے اُتر کی سرزمین میں دریایِ فرات کے کنارے ذبیحہ مقرر ہے" شیعہ صاحبان کہتے ہیں کہ یہ امام حسین کے کربلا میں شہید ہونے کی پیشینگوئی ہے کیونکہ وہ کسی معنی میں ان کی موت کو قربانی اور گناہ کا کفارہ مانتے ہیں۔ لیکن اسی باب کی دوسری آیت میں مرقوم ہے" مصر کے بادشاہ فرعون نکوہ کی فوج کی بابت جو دریایِ فرات کے کنارے پر کرکمیس میں تھی جس کو بابل کے بادشاہ نبوکدنضر نے یہوداہ کے بادشاہ یہویقیم بن یوسیاہ کے چوتھے برس میں شکست دی تھی" ۶۰۶ سال قبل از مسیح ) اور مندرجہ بالا دسویں آیت کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔ کوئی مسلمان یہ خیال نہیں کرسکتا کہ اس بُت پرست مصری لشکر کا قتل ہونا گناہ کا کفارہ تھا۔ جس لفظ کا ترجمہ ذبیحہ کیا گیا ہے اس

کے معنی قتل کے بھی ہیں ( مثلاً اسی قسم کی عبارات سے عیاں ہے یسعیاہ ۳۴: ٦ تا ۸ وحزقی ایل ۳۹ : ۱۷ تا ۲۱- صفنیاہ ۱: ۷تا ۸)علاوہ برین یرمیاہ کسی طرح بھی کربلا کو" اُتر کی سرزمین میں" نہیں کہہ سکتا تھا۔

اب ہم نہایت غوروفکر سےعہدِجدید کی ان عبارات وآیات کودیکھینگے جن کی نسبت اہل اسلام کہتےہیں کہ ان میں حضرت محمد کے حق میں پیشینگوئیاں مندرج ہیں۔

۱- متی ۳: ۲ میں مرقوم ہے " آسمان کی بادشاہی نزدیک آگئی ہے" یہ وہ الفاظ ہیں جو یوحنا بپتسمہ دینے والے نے کہے تھے اورجن کو سیدنا مسیح نے دہرایا (متی ۴: ۱۷)۔ اہلِ اسلام کہتے ہیں کہ اس آیت میں اسلامی سلطنت کے قائم ہونے کی پیشینگوئی ہے (دیکھو متی ۱۳: ۳۱، ۳۲) کیونکہ قرآن قانونِ سلطنت اسلام ہے لیکن یہ سمجھنے کے لئے کہ " آسمان کی سلطنت" سے کیا مرادہے اوراس کے مترادف فقرہ" خدا کی بادشاہی " کا مفہوم کیاہے ضرور ہے کہ ہم عہدِ جدید کی ان تمام عبارات کو دیکھیں جن میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک متی ۱۲: ۲۸ ہے جس میں سیدنا مسیح فرماتے ہیں " اگر میں خدا کی روح کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہی تمہارے پاس آپہنچی"۔ مرقس ۹: ۱ وہ اپنے شاگردوں سے کہتے ہیں" جو یہاں کھڑےہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جب تک خدا کی بادشاہی کو قدرت کے ساتھ آئی ہوئی نہ دیکھ لیں موت کا مزہ ہر گز نہ چکھینگے"۔ بعض آیات میں یہ سلطنت مسیح کی زندگی ہی میں قائم ہوچکی ہے اور بعض میں اس کا قائم ہونا مسیح کی موت کے بعد پایا جاتا ہے۔ اس سلطنت کاآغاز اس کے مصلوب ہونے سے پیشتر ہوا اوراس کی تکمیل اس وقت ہوگی جب وہ جہان کی عدالت کرنے کے لئے دوبارہ آئیگا (دانی ایل ۷: ۱۳، ۱۴، مکاشفہ ۱۱: ۱۵)۔ فی الحال انجیل کی منادی اور تمام بنی آدم کو اس میں داخل ہونے کی دعوت دی جانے کے سبب سے یہ سلطنت ہر روز پھیلتی جاتی ہے(متی ۱۸: ۱۸تا ۲۰)۔ یہ اس جہاں کی سلطنت نہیں ہے (یوحنا ۱۸: ۳٦)۔ یہ دنیوی شان وشوکت کے ساتھ نہیں آتی (لوقا ۱۷: ۲۰)۔ یہ ان کی سلطنت ہے جو دل کے غریب ہیں (متی ۵: ۳)۔ مغروروں کی نہیں۔فقط نئی روحانی پیدائش ہی کے وسیلہ سے لوگ اس میں داخل ہوسکتے ہیں (یوحنا ۳: ۳، ۵) شریروں کا اس میں داخل ہونا ناممکن ہے (۱کرنتھیوں ٦: ۹، ۱۰، گلتیوں ۵: ۲۱، افسیوں ۵: ۵)۔ لہذا یہ وہ سلطنت نہیں ہوسکتی جو حضرت محمد اور ان کے جانشینوں نے قائم کی تھی۔

۲- متی ۱۷: ۱۱ میں مرقوم ہے " ایلیاہ البتہ آئیگا" ۔ بعض مسلمان اس آیت کو حضرت محمد کی آمد کے باب میں پیشینگوئی قرار دیتےہیں لیکن سیدنا مسیح اس کے ساتھ ہی فرماتے ہیں" ایلیاہ توآچکا اور انہوں نے اس کو نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا" (بارھویں آیت) پھر اس کے ساتھ ہی تیرھویں آیت میں یوں مرقوم ہے" تب شاگرد سمجھ گئے کہ اس نے ہم سے یوحنا بپتسمہ دینے والے کی بابت کہاہے"۔ بیشک یوحنا بپتسمہ دینے والا جسمانی طور پر ایلیاہ نہیں تھا کیونکہ اس میں تناسخ ارواح کی تعلیم نہیں دی گئی اوراسی لئے اس نے ان کو یہ جواب دیا تھا(یوحنا ۱: ۲۱) جب انہوں نے اس سے پوچھا کہ وہ ایلیاہ تھا کہ نہیں۔ لیکن وہ" ایلیاہ کی روح اور قوت میں" مسیح کا پیشرو تھا(لوقا ۱: ۱۷)جیسا کہ جبرائیل فرشتہ نے پہلے ہی سے بتادیا تھا(لوقا ۱: ۱۹) اور ان معنوں میں جیسا کہ ملاکی نبی نے پیشینگوئی کی

تھی(ملاکی ۴: ۵)وہ ایلیاہ کی طرح آیا اوراسی کی طرح زندگی بسر کرتا تھا(متی ۳: ۴)۔ کیونکہ ایلیاہ اکثر اوقات بیابان میں رہتا تھا(۱ سلاطین ۱۷: ۱تا ۶)۔

۳۔ متی ۲۰: ۱۶ کی مندرجہ تمثیل میں اہل اسلام کہتے ہیں کہ " صبح سے یہودی "دوپہر" سے مسیحی اور "شام" سے محمدی دین مراد ہے لیکن آٹھویں آیت کی مندرجہ " شام" کا مطلب ۱۹ ویں باب کی ۲۸ ویں آیت میں وہ وقت بتایا گیاہے۔ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھیگا یعنی آخری وقت جبکہ سیدنا مسیح آسمان کے بادلوں پر بڑی قدرت اورجلال کے ساتھ تمام جہاں کی عدالت کرنے کو آئیگا(متی ۲۴: ۳۰، ۳۱، مرقس ۱۳: ۲۶، ۲۷ولوقا ۲۱: ۲۷، مکاشفہ ۱: ۷، ۲۰، ۱۱، ۱۵)۔ یہ امر اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ متی کا ۲۰واں باب لفظ" کیونکہ" سے شروع ہوتا ہے اور تمثیل کے آخر میں یوں مرقوم ہے " اسی طرح آخر اول ہوجائینگے اور اول آخر، جوکہ نہایت خفیف سی تبدیلی کے ساتھ ۱۹ ویں باب کے آخری الفاظ ہیں۔ دنیا کی تواریخ کی شام نزدیک آرہی ہے اورمسلمان اور مسیحی دونوں فریق سیدنا مسیح کی دوسری آمد کے جوکہ جلد وقوع میں آنے والی ہے منتظر ہیں چونکہ سیدنا مسیح زمانہ کے آخر تک سلطنت کریگا اوراپنے ظہور کے وقت زندوں اور مردوں کی عدالت کریگا (۲ تیمتھیس ۴: ۱)۔ اس لئے دین اسلام کی مطلق گنجائش نہیں اوراس تمثیل میں اس کے حق میں پیشینگوئی نہیں ہوسکتی۔

۴۔ متی ۲۱: ۳۳، ۴۴ (نیز دیکھو مرقس ۱۲: ۱تا ۱۱ولوقا ۲۰: ۹۔ ۱۸)اہلِ اسلام کہتے ہیں کہ اس تمثیل میں سیدنا مسیح حضرت محمد کے آنے اوران کے اسلحہ کی کامیابی کی پیشینگوئی کرتا ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ" گھر کا مالک" خود خدا ہے اوراس تمثیل میں مسیح اپنے آپ کوگھر کے مالک کا بیٹا بیان کرتا ہے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس تمثیل میں مسیح اپنے آپ کو یہودیوں سے قتل کیا گیا بیان کرتا ہے۔ بہت بہتر ہوگا اگر وہ سوچیں کہ وہ کیا تمام تسلیم کررہے ہیں۔ اگر مسیح نے یہ کہا تھا تو ان کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ ابن اللہ ہے اور بنی آدم کے گناہوں کے سبب سے مصلوب ہوا۔ اگر یہ سب کچھ تسلیم کرلیا گیا ہے تو حضرت محمد کے حق میں کوئی پیشینگوئی تلاش کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ بلکہ اگر اہل اسلام یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسیح نے ایسا کہا تو ان کو مطلق یہ حق حاصل نہیں کہ اس تمثیل کو مسیح کی بیان کردہ بتائیں اوراس کے معانی سے ان کو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ پس اس سے ان کی دلیل بالکل ردی ہوجاتی ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس تمثیل میں بیٹے کے بعد کوئی نوکر نہیں بھیجا گیا۔ چونکہ مسلمان تسلیم کرتے ہیں کہ جو نوکر گھر کے مالک نے بھیجے ان سے خدا کی نبی مراد ہیں لہذا یہ تمثیل سے صاف عیاں ہے کہ مسیح کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔ اس سے ان کے تمام استدلال کی دوبارہ تردید ہوتی ہے۔ پھر مسیح نے زبور ۱۱۸: ۲۲ سے " معماروں کے ردکئے ہوئے پتھر" کا بیان اقتباس کیا ہے اوراعمال الرسل ۴: ۱۱، ۱۲ میں پطرس بتاتا ہے کہ اس پتھر سے زبور نویس کا مقصود خود مسیح ہی[1] تھا۔ چنانچہ وہ کہتاہے " یہ وہی پتھر ہے جسے تم معماروں نے حقیر جانا"۔ لہذا معمار اسی کے زمانے کے یہودی تھے نہ کہ ابراہیم واسماعیل جواسلامی کہانی کے مطابق کعبہ کے تعمیر کرنے والے تھے۔ تمثیل میں مرقوم ہے کہ خدا کی سلطنت

---

[1] نیز دیکھو ۱ پطرس ۲: ۴تا ۸

یہودیوں سے لے لی جائیگی اور" اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دیدی جائیگی "(متی ۲۱: ۴۳)۔ اہلِ اسلام کہتے ہیں کہ اس سے بنی اسماعیل مراد ہیں۔ لیکن انجیل سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو مسیح پر حق ایمان لاتے ہیں اور جو برگزیدہ نسل ۔ شاہی کاہنوں کا فرقہ ، مقدس قوم اور ایسی امت ہیں جو خدا کی خاص ملکیت ہیں۔ جو اس کی خوبیوں کو ظاہر کرنے کے لئے برگزیدہ ہوئے جس نے ان کو تاریکی سے اپنی عجیب روشنی میں بلایا ہے۔ جو پہلے کوئی امت نہ تھے مگر اب خدا کی امت ہیں۔ جن پر پہلے رحمت نہ ہوئی تھی مگر اب رحمت ہوئی ہے"(۱پطرس ۲: ۹، ۱۰)۔ اس عبارت سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ خداوند خدا کونسے پھل طلب کرتا تھا۔ ططس ۲: ۱۴ میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے(نیز دیکھو گلتیوں ۵: ۲۲تا ۲۴)۔ اور باغبانوں کا مفہوم جن کو باغ دیا جانے کو تھا مسیحی کلیسیا ہے اور باغ سے خدا کی سلطنت مراد ہے (متی ۲۱: ۴۳ سے ۱۴ ویں آیت کی تشریح ہوتی ہے )۔ لہذا اور " باغبانوں " کا مفہوم حضرت محمد اوران کے تابعین ومومنین نہیں ہوسکتے ۔ چونکہ پتھر مسیح ہے لہذا اس کا مفہوم نہ کعبہ کی دیوار نہ اس کا حجر الاسود ہوسکتا ہے اور نہ حضرت محمد۔ تمثیل سے ظاہر ہے کہ مسیح سے مخالفت خدا کی نظر میں نہایت ناپسندیدہ ہے اور آخر کار اس کے دشمنوں کی سخت بربادی کا باعث ہوگی ۔ مسیح کے مصلوب ہونے کے قریباً چالیس سال کے بعد ۷۰ء میں رومیوں کے ہاتھ سے یروشلیم کی بربادی سے اس کے کچھ معانی کی تشریح ہوگئی تھی۔ بعض مسلمان خیال کرتے ہیں کہ " باغ کا مالک " جو آنے والا تھا اس سے حضرت محمد مراد ہیں ۔ لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کیونکہ ۳۷ویں آیت کے مطابق مسیح باغ کے مالک کا بیٹا ہے اور کوئی بھی اس کو حضرت محمد کا بیٹا خیال نہیں کرتا۔ اس تمثیل کے متعلق اسلامی خیالات کی صورت فقط اس حالت سے کچھ بہتر ہوسکتی ہے جبکہ الفاظ کو ان کے مناسب مقامات سے جدا کرلیا جائے اور اگلی پچھلی عبارت اور قرینہ کا کچھ خیال نہ کیا جائے اور بائبل کے دیگر مقامات میں جو کچھ اس تمثیل کے معانی بیان کئے گئے ہیں ان کا بھی کچھ لحاظ نہ کیا جائے ۔

۵۔ مرقس ۱: ۷ میں مرقوم ہے " میرے بعد وہ شخص آنے والا ہے جو مجھ سے زور آور ہے" ۔ لہذا اہلِ اسلام کہتے ہیں کہ " انجیل میں سیدنا مسیح کا کلام مندرج ہے اور مرقس ۱: ۷ میں اس نے حضرت محمد کے حق میں پیشینگوئی کی ہے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اہل اسلام کے لئے حضرت محمد کے حق میں کوئی پیشینگوئی تلاش کرنا اور پانا کیسا ناممکن ہے کیونکہ اسی باب کی چھٹی آیت سے اظہر من الشمس ہے کہ ساتویں آیت کے مندرجہ بالا الفاظ مسیح کا کلام نہیں ہیں بلکہ ان کا کہنے والا یوحنا بپتسمہ دینے والا ہے۔ علاوہ بریں یوحنا ۱: ۲۶، ۳۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ یوحنا بپتسمہ دینے والے نے سیدنا مسیح کا ذکر کیا تھا ۔ حضرت محمد کا نام تک نہیں لیا۔ متن کی عبارت سے یہ حقیقت صاف عیاں ہے(دیکھو متی ۳: ۱۱، ۱۴ لوقا ۳: ۱۶، ۱۷) اگر کوئی یوں کہے کہ مسیح تو اس وقت دنیا میں موجود ہی تھا۔ وہ یوحنا کے بعد آنے والا نہیں کہلاسکتا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ مسیح نے منادی کرنا اور انجیل کی خوشخبری دینا اس وقت شروع کیا تھا جب یوحنا قید ہوچکا تھا(مرقس ۱: ۱۴، نیز دیکھو متی ۴: ۱۲، ۱۷)اور تھوڑا ہی عرصہ بعد ہیرودیس کے حکم سے قید خانہ ہی میں اس کا سر قلم کیا گیا تھا۔

۶- یوحنا ۱: ۲۱- بعض مسلمان کہتے ہیں" اس آیت میں حضرت محمد کا صاف اور صریح ذکر ہے۔ یہودیوں نے تین نبیوں کا ذکر کیا یعنی مسیح اور ایلیاہ سے حضرت محمد مراد ہیں جن کے حق میں استثنا ۱۸: ۱۸ میں پیشینگوئی موجود ہے۔ وہ نبی کا مفہوم مسیح اور ایلیاہ نہیں ہوسکتے کیونکہ ان کا ذکر جداگانہ کیا گیاہے۔ لیکن ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ استثنا ۱۸: ۱۸ میں حضرت محمد کا مطلق ذکر نہیں ہے اوروہ پیشینگوئی سیدنا مسیح کے حق میں ہے لہذا اس آیت زیر بحث کا" وہ نبی" سیدنا مسیح ہیں۔یہودیوں نے یوحنا بپتسمہ دینے والے کے بارے میں خیال کیا کہ شاید وہی مسیح موعود ہے۔جب اس نے مسیح ہونے سے انکار کیا توانہوں نے پوچھا کہ کیا تو مسیح کا پیشروایلیاہ ہے (ملاکی ۴: ۵، متی ۱۷: ۱۰، مرقس ۹: ۱۱)۔یوحنا نے سمجھادیا کہ وہ جسمانی طورپر ایلیاہ نہیں تھا اور نہ ایلیاہ ہی یہودیوں کی امید کے موافق زمین پرواپس آیا (اگرچہ ملاکی ۴: ۵) میں یوحنا ہی کی طرف اشارہ ہے۔(دیکھو متی ۱۱: ۱۴)۔ تب یہودیوں کو یہ سمجھنا مشکل ہوگیا کہ وہ کون تھا۔ اس حالت میں استثنا ۱۸: ۱۸ کی طرف اشارہ کرکے انہوں نے پوچھا کیا تو" وہ نبی" ہے؟ استثنا ۱۸: ۱۸ کے معنوں کے بارے میں ان ایام میں یہودیوں میں کچھ اختلاف رای تھا۔ بہت سے یہودی اس کا ٹھیک مطلب سمجھتے تھے کہ اس میں مسیح موعود کی آمد کی پیشینگوئی ہے جیسا کہ یوحنا ۶: ۱۴ سے صاف عیاں ہے لیکن اوروں کی یہ رای نہیں تھی کہ کیونکہ جیسا کہ یوحنا ۷: ۴۰، ۴۱ سے معلوم ہوتا ہے وہ سمجھتے تھے کہ استثنا ۱۸: ۱۵، ۱۸ کے مطابق مسیح موعود کا ایک اور پیشرو آنے والاہے۔ یوحنا ۱: ۱۹، ۲۸ کی تمام عبارت سے ظاہر ہے کہ پوچھنے والے یہ جاننا چاہتے تھے کہ یوحنا بپتسمہ دینے والا مسیح موعود تھا یا اس کا پیشرو۔ یہ پوچھنا بالکل نامعقول ہوتا کہ یوحنا سیدنا مسیح کے صدہا سال بعد آنے والامفروضہ نبی تھا یا نہیں جبکہ ابھی مسیح موعود نے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا تھا اورانہوں نے اس کوابھی پہچانا نہ تھا۔

۷- یوحنا ۴: ۲۱ کو بعض مسلمان اس امر کا اعلان فرض کئے بیٹھے ہیں کہ یروشلیم آئندہ زمانہ میں مقدس شہر اور قبلہ نہیں رہے گا بلکہ اس کی جگہ ایک اور شہر لےلیگا جو مسلمانوں کے بیان کے مطابق مکہ ہے۔ لیکن ۲۳ویں اور ۲۴ویں آیات میں سیدنا مسیح اپنے کلام کا مطلب آپ ہی سمجھادیتا ہے۔ وہ فرماتاہے کہ حقیقی اور خدا کی نظر میں پسندیدہ عبادت کا انحصار جای عبادت پر نہیں بلکہ عابد کی دلی حالت پر ہے ۔لہذا وہ بعد میں زمین پر کسی حقیقی قبلہ کا امکان ہی باقی نہیں چھوڑتا۔

۸- یوحنا ۱۴: ۳۰میں مرقوم ہے" دنیا کا سردار آتا ہے"۔ بہت سے مسلمان خیال کرتے ہیں کہ مسیح کے ان الفاظ میں حضرت محمد کی آمد کی پیشینگوئی ہے لیکن اول تو متن کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اس موقع پر مسیح کسی اپنے بعد آنے والے نبی کا ذکر نہیں کررہا تھا کیونکہ وہ ساتھ ہی فرماتاہے " اور مجھ میں اسکا کچھ نہیں"۔اس سے عیاں ہے کہ جس شخص کا سیدنا مسیح نے ذکر کیا وہ تمام نیکی کا دشمن ہے اورایسی بات کسی نبی کے حق میں ہر گز ہر گز نہیں کہہ سکتے۔ دوم جب ہم کتب مقدسہ کے دیگر مقامات کو دیکھتے ہیں جہاں یہی لقب یا اوراس کے ہم معنی القاب شخص مذکورہ کو دئے گئے ہیں توصاف منکشف ہوجاتاہے کہ وہ شیطان ہے ۔(دیکھو لوقا ۱۰: ۱۸، یوحنا ۱۲: ۳۱، ۱۶: ۱۱، ۲کرنتھیوں ۴: ۴وافسیوں ۲: ۲، ۶: ۱۱، ۱۲۔

۹- یوحنا ۱۴: ۱۶، ۱۷، ۲۶، ۱۵: ۲۶، ۱۶: ۱۳ وغیرہ ۔مسلمان کہتے ہیں کہ پراقلیط جس کا مسیح نے ان آیات میں ذکر کیا ہے وہ حضرت محمد ہی ہیں ان کے خیال میں محمد لفظ پراقلیط کا ترجمہ ہے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ پیشینگوئی حضرت محمد میں پوری ہوگئی تھی کیونکہ ان کو جبرائیل کے وسیلہ سے (جس کو اہلِ اسلام روح القدس خیال کرتے ہیں) قرآن پہنچا اورانہوں نے مسیح پر گواہی دی (یوحنا ۱۵: ۲۶) اوراس کو نبی مان کر کنواری سے متولد شدہ تسلیم کرکے اور معجزات کا کرنے والااور زندہ آسمان پر جانے والا قرار دے کر اس کا جلال ظاہر کیا (یوحنا ۱۶: ۱۴)اور یہ کہ وہ ابن اللہ نہیں تھا اور نہ اس نے کبھی ابن اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اوراس پر انجیل نازل ہوئی ۔ نیز مسلمان کہتے ہیں کہ جب مانی نے پراقلیط ہونے کا دعویٰ کیا تو بہت سے مسیحیوں نے اس پیشینگوئی کی بنا پر قبول کرلیا ۔ اس حقیقت سے صاف عیاں ہے کہ قدیم زمانہ کے مسیحی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ مسیح نے اپنے بعد ایک بڑے نبی کے آنے کی پیشینگوئی کی ہے لیکن جو کچھ سیدنا مسیح نے انجیلِ یوحنا کے چودھویں پندرھویں اور سولھویں باب میں فرمایا ہے اس کے یہ معنی کسی عالم یا کسی شخص کے نزدیک جو عہدِ جدید کو بغور پڑھنے ہر گز ہر گز قابل قبول نہیں ہوسکتے کیونکہ ۔

اول تو پراقلیط کے معنی کو محمد سے کسی طرح کا کوئی علاقہ وواسطہ نہیں۔ اس کے معنی" تسلی دینے والا" ، مددگار" اور "وکیل" ہیں۔ ان میں سے پہلے معنی تو صاف طور سے النبی بالسیف کی شان کے خلاف ہیں اور قرآن کے خدا کے سوا کسی کے حق میں بھی وکیل کو استعمال نہیں کرتا (سورہ بنی اسرائیل آیت ۵۶ اور سورہ نساآیت ۸۳) لہذا حضرت محمد پراقلیط نہیں ہوسکتے۔ (۲) عہدِ عتیق میں لقب پراقلیط فقط روح القدس ہی کے لئے استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ آیات ذیل سے عیاں ہے (یوحنا ۱۴: ۱۶، ۱۷، ۲۶، ۱۵: ۲۶، ۱۶: ۱۳ اور اشارۃً مسیح کے لئے بھی استعمال ہوا ہے (یوحنا ۱۴: ۱۶، دیکھو یوحنا ۲: ۱)۔

سوم لہذا جس پراقلیط کا مسیح نے ذکر کیا وہ آدمی نہیں بلکہ روح ہے یعنی روحِ حق جو نادیدنی ہے ۔ وہ روح اس وقت مسیح کے شاگردوں کے ساتھ ان کے دلوں میں سکونت پذیر تھا(یوحنا ۱۴: ۱۷، ۱۶: ۱۴)۔

چوتھا ۔ مسیح اس کا بھیجنے والا تھا(یوحنا ۱۵: ۲۶، ۱۶: ۷)۔ یہ سب کچھ اہلِ اسلام حضرت محمد کے حق میں ہر گز ہر گز تسلیم نہیں کرسکتے۔

پانچواں۔ اس کا کام لشکر جمع کرنا اور دنیاوی ہتھیاروں کے وسیلہ سے فتوحات حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ بنی آدم کو گناہ سے قائل کرنا اور یہ بتانا کہ مسیح پر ایمان نہ لانا گناہ کا ست اوراصل ہے (۱۶: ۹)۔ چھٹا۔اس کی تعلیم کا مقصد اپنی عزت نہیں بلکہ مسیح کا جلال ظاہر کرنا تھا اور وہ تعلیم اس کی اپنی نہیں تھی بلکہ جو مسیح نے اسے دی (یوحنا ۱۶: ۱۴، ۱۵)۔(۷) بنی آدم کو مسیح کی ابنیت سے انکار کرنے کی تعلیم دینا جس کی مسیح نے قسمیہ بیان سے تائید وتصدیق کی (مرقس ۱۴: ۶۱)اوراس کی الہیٰ ذات پر ایمان لانے کی مخالفت کرنا جس کی (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) عہدِ عتیق وجدید دونوں میں تعلیم دی گئی ہے (مثلاً یسعیاہ ۹: ۶، زبور ۴۵: ۶ ویوحنا ۱۰: ۳۰، عبرانیوں ۱ میں) مسیح کا جلال ظاہر کرنا نہیں بلکہ اس کی مخالفت کرناہے۔(۸) اس حقیقت سے انکار کرنا کہ مسیح مصلوب ہوا اوراس طرح سے اس نے تمام جہان کے گناہوں کا کفارہ دیا تمام بائبل کی ایک اور نہایت ضروری تعلیم سے انکار

کرنا ہے(زبور ۲۲، یسعیاہ ۵۲: ۱۳اور ۵۳واں باب - متی ۲۰: ۱۹وغیرہ وغیرہ)۔ کیونکہ جو کفارہ اس نے صلیبی موت کے وسیلہ سے دیا اسی پر تمام بنی آدم کی نجات کا انحصار ہے۔(۹) اس کے مصلوب ہونے سے انکار کرنا اس کے جی اٹھنے سے انکار کرنا ہے جو کہ مسیحی دین کی بنیاد ہے (۱کرنتھیوں ۱۵: ۱۷تا ۱۹)۔ لہذا چونکہ حضرت محمد اس تعلیم اور دیگر بڑی تعلیمات کے باب میں انجیل کی مخالفت کرتے ہیں اوراس طرح اس دین کی سخت مخالفت کرتے ہیں جس کی سیدنا مسیح نے تعلیم دی اوراپنے شاگردوں کو تمام اقوام کو تعلیم دینے حکم دیا(متی ۲۸: ۱۸تا ۲۰)۔ اس لئے یہ کہنا نا ممکن ہے کہ حضرت محمد نے اس پیشینگوئی کو پورا کیا کہ پراقلیط رسولوں کو وہ سب باتیں یاددلائیگا جس کی مسیح نے ان کو تعلیم دی تھی(یوحنا ۱۴: ۲۶)۔ (۱۰)مانی کے پراقلیط ہونے کے دعویٰ کو پیش کرکے حضرت محمد کے پراقلیط ہونے کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا استدلال کا نہایت عجیب طریقہ ہے۔ اگرہم مسیحی لوگ حضرت محمد کو مانی کی مانند اور قرآن کو ارتنگ[1] کی مانند بیان کریں (کیونکہ مانی کا دعویٰ تھا کہ ارتنگ اس پر آسمان سے نازل ہوئی اورایسی تھی کہ کوئی اس کی مانند لانے پر قادر نہ تھا) توہمارے مسلمان بھائی بہت خفا ہوجائینگے۔ واضح ہو کہ ان اوراق کا مصنف اس قسم کی مشابہت بہم پہنچانے سے پرہیز کرتا ہے۔ لیکن یہ اظہر من الشمس ہے کہ جن مسیحیوں نے اچھی طرح تعلیم پائی تھی انہوں نے مانی کو قبول نہیں کیا۔ خاص کراس لئے کہ (۱) وہ پیشینگوئیاں جو پراقلیط کے بارے میں تھیں کسی آدمی میں ان کا پورا ہونا غیر ممکن تھا۔ وہ فقط روح القدس ہی سے پوری ہوسکتی تھیں اور (۲) یہ پیشینگوئیاں مسیح کے مصلوب ہونے کے بعد پچاسویں روز پوری ہوچکی تھیں (اعمال الرسل ۲: ۱تا ۳۶)۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عہدِ جدید کی تعلیم مانی کے ایام میں وہی تھی جو کہ اب ہے۔ مسیح کی پیشینگوئیاں اس کے بعد آنے والے نبیوں کے حق میں ایسی نہیں تھیں جو کہ کوئی نبی ہونے کادعویٰ کرتا---۔ مسیحی اس کو قبول کرلیتے(متی ۲۴: ۱۱، ۲۴، مرقس ۱۳: ۲۲، دیکھو متی ۷: ۱۵)۔ لہذا انہوں نے مانی کو رد کیا جس کو اہل اسلام بھی جھوٹا نبی مانتے ہیں(۱۱) پراقلیط کو تمام سچے مسیحیوں کے دلوں میں سکونت کرنا تھا(یوحنا ۱۶: ۱۴، دیکھو ۱کرنتھیوں ۶: ۱۹اور رومیوں ۸: ۹)۔ جو حضرت محمد کے حق میں ہر گز نہیں کہا جاسکتا۔(۱۲) مسیح نے وعدہ فرمایا تھا کہ پراقلیط یعنی روح القدس (یوحنا ۱۴: ۲۶)اس کے آسمان پر چلے جانے کے چند ہی روز بعد آسمان سے نازل ہوگا (اعمال الرسل ۱: ۵)اوران کو حکم دیا تھا کہ جب تک پراقلیط ان پر نازل نہ ہو دنیا کو انجیل سنانے کا کام شروع نہ کریں(متی ۲۸: ۱۹، ۲۰) بلکہ جب تک یہ وعدہ پورا نہ ہو یروشلیم میں ٹھہرے رہیں (لوقا ۲۴: ۴۹، واعمال الرسل ۱: ۴، ۸)۔ کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ جب تک حضرت محمد نبوت کا دعویٰ نہ کریں تب تک یعنی قریباً چھ سو سال تک انتظار کریں؟ اس وقت تک وہ سب کے سب مرچکے تھے۔ علاوہ بریں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ وعدہ پنتکوست کے دن پورا ہوگیا تھا (اعمال الرسل ۲ باب) یعنی مسیح کے صعود کے بعد فوراً ہی پورا ہوا۔ تب اپنے فرض کو ٹھیک طور سے سمجھ کرانہوں نے تمام جہان میں

---

[1] یہ حقیقت کہ مانی مصور تھا اور کتاب ارتنگ تصویروں سے پُر تھی شاہنامہ میں مذکور ہے۔ لیکن الیعقوبی، البرونی، الشہرستانی اور دیگر عربی مصنفین نے اسکا ذکر نہیں کیا۔

انجیل سنانے کا کام شروع کیا۔ لہذا صاف ظاہر ہے کہ پراقلیط کے آنے کے وعدہ میں حضرت محمد کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

(۱۰)۔ یوحنا ۴: ۲، ۳سے بعض نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ " خدا کی روح" سے حضرت محمد مراد ہیں۔ لیکن کوئی سچا مسلمان کبھی حضرت محمد کو ایسے لقب سے ملقب نہیں کرتا۔ بعض کہتے ہیں کہ دوسری آیت کے مطابق حضرت محمد نے یہ تعلیم دی سیدنا مسیح مجسم ہو کر آیا" کیونکہ انہوں نے مسیح کی الوہیت کا انکار کیا اور اس کو محض انسان قرار دیا۔ لیکن " مجسم ہو کر آنا" اگر کسی محض انسان کے حق میں استعمال کیا جائے تو اسکے کچھ معنی ہی نہیں ہیں۔ فی الحقیقت یہ آیت اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ مسیح کا جسم غیر حقیقی تھا اوراس کی انسانی صورت محض خیالی ہی تھی۔ یہ عقیدہ کہ مسیح محض انسان تھا اسی خط میں نہایت سخت وپرزور الفاظ میں رد کیا گیا ہے(۱ یوحنا ۲: ۲۲، ۲۳، ۵: ۵، ۹، ۱۳، ۲۰)۔ لہذا (۱ یوحنا ۴: ۲، ۳) سے جو نتیجہ علما نکالتے ہیں اس سے کسی صورت میں بھی حضرت محمد کے دعاوی کی تائید نہیں ہوتی۔

گیارہواں۔ یہوداہ ۱۴، ۱۵ ۔ بعض لوگوں نے یہ کہنے کی جرات کی ہے کہ ان آیات میں " خداوند " سے حضرت محمد مراد ہیں اور " انصاف کرنے" سے آنحضرت کا النبی بالسیف ہونا اور اپنے دشمنوں سے جنگ کرنا مقصود ہے۔ لیکن کوئی سچا مسلمان اس عقیدہ کا معتقد نہیں ہوسکتا کیونکہ " خداوند" یعنی الرب خدا کےلئے ہے اور قرآن میں اسی ذوالجلال کے لئے استعمال ہواہے(دیکھو سورہ توبہ آیت ۳۱) حنوک کی پیشینگوئی جویہوداہ نے اقتباس کی اس سے مسیح کی دوسری آمد مراد ہے جبکہ وہ جہان کی عدالت کریگا(دانی ایل ۷: ۳، ۲۴، متی ۲۴: ۲۹، ۵۱- ۲ تھسلنیکیوں ۱: ۶، ۱۰ مکاشفہ ۱: ۷، ۱۹: ۱۱- ۲۱) لقب "خداوند"عہدِجدید میں کئی بار مسیح کے حق میں استعمال کیا گیاہے اور زیادہ صحت کے ساتھ ہم کو یہ بات فلپی ۲: ۹تا ۱۱ سے معلوم ہوتی ہے۔

بارہواں۔ مکاشفہ ۲: ۲۶تا ۲۹ ۔ بعض مسلمان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بھی النبی بالسیف کے حق میں پیشینگوئی ہے۔ لیکن اگران کا دعویٰ سچ ہے واس سے یہ نتیجہ نکلیگا کہ حضرت محمد نے مسیح سے اختیار حاصل کیا کیونکہ اس نے مسیح کاموں کے موافق آخر تک عمل کیا یعنی آخر تک اس کی فرمانبرداری کی۔ اہل اسلام مانتےہیں کہ حضرت محمد مسیح سے بڑے نبی تھے اور اس لئے ان کے لئے تسلیم کرنا محال ہے کہ ان آیات کا اشارہ حضرت محمد کی طرف ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ان آیات میں متکلم مسیح ہے اور وہ خدا کو اپنا باپ بیان کرتا ہے۔ان آیات کے معنی ذیل کی آیت سے مقابلہ کرنے سے صاف عیاں ہوجاتےہیں ۷: ۱۱، ۱۷، اور تیسرا باب ۵، ۱۲، ۲۱ جن میں "جو غالب آئے" کا فقرہ بار بار دہرایا گیاہے۔ متن کی اگلی پچھلی عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ عام ہے یعنی ہر ایک کے لئے جو غالب آئے اور یہ غلبہ دوسرے آدمیوں پر نہیں بلکہ اپنے گناہوں اور دنیا کی آزمائشوں اور جسم وشیطان پر حاصل کرتا ہے۔

یہ وہ تمام عبارات ہیں جن میں اہل اسلام خیال کرتے ہیں کہ حضرت محمد کے حق میں پیشینگوئیاں مندرج ہیں۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ان میں سے ایک میں بھی آنحضرت کے حق میں کوئی پیشینگوئی موجود نہیں ہے۔ علاوہ بریں عہدِجدید سے ہم کوایسی ہدایت بھی نہیں ملتی کہ مسیحی دین کے بعد

مسیح کی دوسری آمد اوراس کی ابدی سلطنت کے کامل قیام سے پیشتر ہم کسی دوسرے دین وشریعت کا انتظار کریں۔ لہذا حضرت محمد کے منجانب اللہ ورسول ہونے کا مندرجہ بالا ثبوت پورے طور پر بیکار ہوگیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ مکاشفہ ۹: ۴ میں ان الفاظ کو دیکھ کر سخت حیران ہوتے ہیں "اوران سے کہا گیا کہ ان آدمیوں کے سوا جن کے ماتھے پر خدا کی مہر نہیں زمین کی گھاس یا کسی ہریادل یا کسی درخت کو ضرور نہ پہنچانا" کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جب خلیفہ ابوبکر نے سیریا کی تسخیر کے لئے اسلامی لشکر بھیجے اس وقت یہ پیشینگوئی فی الحقیقت پوری ہوگئی۔ یہ امر سچ مچ قابلِ لحاظ ہے کہ دو عربی مورخ جو غالباً مکاشفہ کی عبارت مندرجہ بالاآیت یاد دلاتے ہیں۔ شیخ جلال الدین سیطوی [1] البھقی وغیرہ سے نقل کرتا ہے کہ عمران الجونی نے بیان کیاکہ حضرت ابوبکر نے جب یزید ابن ابی سفیان کو اس لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا جو سیریا کو جارہا تھا تو اس سے کہا" تم کسی عورت یا بچے یا پیر فرتوت کو قتل نہ کرنا۔ پھل دار درختوں نہ کاٹنا، مزروعہ زمین کو مت اجاڑنا، بھیڑیا بار برداری کے جانور کو ذبح مت کرنا مگر کھانے کے لئے، کھجور کے درخت کو نہ کاٹنا نہ جلانا نہ فریب دینا نہ بزدلی دکھانا"۔ کاتب [2] الواقدی بھی یہی بات زیادہ تفصیل وطوالت کے ساتھ لکھتاہے۔ چنانچہ اس کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضرت ابوبکر نے یزید سے کہا" جب تم اپنے دشمنوں پر غالب آجاؤ گے تو کسی لڑکے یا پیر مرد یا عورت یا شیر خوار کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درخت کے پاس نہ جانا۔ پکے ہوئے کھیت کو مت جلانا کسی پھلدار درخت کو نہ کاٹنا، نہ کسی جانور کو ذبح کرنا مگر کھانے

[1] تاریخ الخلفاء مطبوعہ محمدی پریس لاہور پنجاب ۱۳۰۴ ہجری صفحہ ٦٦

[2] فتوح شام مطبوعہ نول کشور پریس کانپور ۱۲۸۷ ہجری صفحہ ۵

کے لئے، جب کوئی عہد کرو تو فریب مت دینا اورجب صلح کرلو تو عہد شکنی مت کرنا اور تم ان لوگوں کے پاس سے گذروگے جو حجروں میں ہیں یعنی راہب لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ وہ خدا کی عبادت کررہے ہیں۔ اس لئے ان کو کچھ مت کہنا۔ انہوں نے اپنے آپ کو خدا سے پوشیدہ نہیں کیا اور وہی ان کے لئے کافی ہے۔ تم نہ ان کے حجرے مسمار کرنا نہ ان کو قتل کرنا۔ تم کو ایک اورجماعت ملیگی جو کہ شیطانی فرقہ اور صلیب پرست ہیں۔ جنہوں نے اپنے سروں کو بیچ سے مونڈا ہے اور قطار کے گھونسلے سے نظر آتے ہیں۔ پس اپنی تلواریں ان کے سروں کے بیچ میں مارنا۔ یہاں تک کہ وہ اسلام کی طرف پھریں یا جزیہ دیں اور ذلیل ہوں۔ خدا حافظ [3] "۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب مکاشفہ کی پیشینگوئی اوراس حکم میں جو عربوں کو دیا گیا جو ملک ملک سے ویسے ہی شمار میں نکلے بہت بڑی مشابہت ہے۔ لیکن اس عبارت میں کسی نبی کا مطلق ذکر نہیں ہے لہذا اس کو حضرت محمد نے دعاوی تصدیق وتائید میں پیش نہیں کرسکتے نہ کوئی سچا مسلمان مکاشفہ کے اس باب کو اطمینان کے ساتھ پیش کرسکتا ہے اگرچہ یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ پیشینگوئی تھی جو حضرت محمد کی وفات کے چند سال بعد پوری ہوئی۔

[3] روضتہ الصفا جلد دوم صفحہ ١٦٤ پر مرقوم ہے کہ جنگِ تبوک سے پہلے اپنے لشکر کو حضرت محمد نے بھی مختصراً یہی ہدایتیں دی تھیں۔ دیکھو تیسرا حصہ ساتواں باب۔

# تیسرا باب

## کیا قرآن کی زبان اور طرزِ بیان معجزانہ اور اس امر کا ثبوت ہیں کہ قرآن کلام اللہ ہے؟

ہمارے مسلمان بھائی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کی فصاحت وطرز بیان کی خوبی بجائے خود معجزہ ہیں اوراس لئے قرآن ہی حضرت محمد کی نبوت ورسالت کا کافی ثبوت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت نوشت وخواند سے بے بہرہ تھے لہذا وہ خود ایسی کتاب تصنیف نہیں کرسکتے تھے۔ اس سے وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قرآن ضرور وحی آسمانی کے ذریعہ سے آنحضرت کو دیا گیا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر ایک نبی کو من جانب اللہ ہونے کے ثبوت کے طور پر کوئی خاص نشان یا معجزہ عطا کیا گیا تھالیکن انبیاء کے نشانات ومعجزات ان کےزمانوں کے لحاظ سے مختلف تھے۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں جادوگروں کی بہت قدرومنزلت تھی ۔ اس لئے جو معجزات حضرت موسیٰ نے دکھائے وہ بظاہر انہیں کے شعبدوں کی مانند تھے اگرچہ حقیقی اور زیادہ حیرت انگیز تھے۔ حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں فنِ طبابت ومعالجہ نے بہت ترقی کی تھی لہذا انہوں نے بیماروں کو شفا بخشنے میں خرقِ عادت وبالائِ امکان انسانی کرشمے دکھائے۔ حضرت محمد کے زمانہ میں اہلِ عرب فصاحت وبلاغت کی بہت قدر کرتے تھے ۔اس لئے جو کتاب آنحضرت کو عطا ہوئی وہ فصاحت وبلاغت اور علم عروض وشاعری میں سب سے سبقت لے گئی ۔اس اعجازِ قرآنی کے ثبوت میں وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی اعجاز قرآنی کاقائل نہ ہو تو اس کی مانند ایک آیت بنا کر دکھائے۔قرآن میں بھی یہی دلیل مندرج ہے (سورہ بقرہ آیت ۲۱ اور سورہ بنی اسرائیل آیت ۹۱)۔

لیکن جب اس دلیل پر مناسب طور سے غور وفکر سے نظر کرتے ہیں تو ہم کو یہ دلیل کچھ مضبوط نہیں معلوم ہوتی۔اول تو دنیا میں چند ایسی مشہور کتابیں موجود ہیں جن کے مصنف لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اورجو اپنی اپنی زبان میں بالکل بے نظیر ہیں۔ رگوید ہندوستان میں ۱۰۰۰ سے ۱۵۰۰ سال قبل ازمسیح کے درمیان تصنیف کیا گیا اور یہ اس ملک میں لکھنے پڑھنے کے رواج سے بہت عرصہ پیشتر کا زمانہ تھا۔ یہ ایک ضیغم کتاب ہے۔ جو قرآن سے بہت بڑی ہے۔ یہ ایک ہی آدمی کی تصنیف نہیں بلکہ اسکے مصنف بہت سے تھے اوران کے پاس کوئی منشی ومحرر نہ تھے جوان کی آیات کو لکھتے۔ یونانی زبان میں دونہایت فصیح وبلیغ نظمیں ہیں یعنی الیڈ اور اوڈیسے جو عموماً ایک نابینا شاعر ھومر نامی کی تصنیف بیان کی جاتی ہیں۔ اس زمانہ میں عام طور پر نابینا لوگ نوشت وخواند پر قادر نہ تھے ۔ ممکن ہے کہ ھومر کے زمانہ میں یونانی حروف ھجا موجود ہوں لیکن اغلباً اس نے ان کو استعمال نہیں کیا اوراپنی نظمیں محرروں سے بھی تحریر نہیں کروائیں زیادہ تر اس لئے کہ وہ غریب آدمی تھا اوراپنی روزی پیدا کرنے کے لئے دربدر اپنی نظمیں سناتا پھرتا تھا جیسا کہ اس زمانہ میں مشرقی ممالک میں افسانہ گو پھرتے ہیں۔

علاوہ بریں یہ بھی امر مسلمہ نہیں کہ حضرت محمد لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ان کے نوشت وخواند سے بے بہرہ ہونے کا ثبوت محض سورۃ الاعراف کی ۱۵۸ ، ۱۵۹ آیت کے الفاظ النبی الامی پر مبنی ہے ۔لیکن النبی الامی کا مطلب" ناخواندہ نبی" نہیں ہے" نبی غیر قوم" ہے یعنی وہ نبی جو کہ بنی اسرائیل میں سے نہیں بلکہ من الامیین یا غیر اقوام میں سے ہے۔ یہ بات سورہ آل عمران کی ۱۹ ویں آیت سے صاف ظاہر ہے جہاں حضرت محمد کو یہ حکم ملتا ہے وَقُل لِّلَّذِينَ أُوْتُواْ الْكِتَابَ وَالأُمِّيِّينَ۔ اس سے بصراحت عیاں ہے کہ اہل عرب اہل الکتب کے مقابلہ میں امیین یعنی غیر اقوام کہلاتے ہیں ۔لہذا النبی الامی یعنی" نبی غیر قوم" آج کل کے مروجہ لقب النبی العربی" کے برابر ہے لیکن اس کا مطلب ہر گز ہر گز نوشت وخواند سے بے بہرہ ہونا نہیں ہے۔ اہلِ علم اس سے بھی واقف ہیں کہ مسلم وبخاری کی روایت سے ایسی احادیث موجود ہیں جو حضرت محمد پر سے غیر تعلیم یافتہ وناخواندہ ہونے کے دھبے کو دور کردیتی ہیں۔ مثلاً یوں لکھا ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے عہد نامہ پر دستخط ہورہے تھے ۔ حضرت محمد نے حضرت علی سے قلم لے کر اس کا لکھا ہوا "رسول اللہ" کاٹ دیا اوراس کی جگہ اپنے ہاتھ سے "بن عبد اللہ" لکھ دیا۔ علاوہ بریں احادیث میں یہ بھی مرقوم ہے کہ حضرت محمد کی وفات حسرت آیات کا وقت آیا تو اپنے جانشین کے نام لکھنے کے لئے آپ نے قلم ودوات کو طلب فرمایا لیکن قلم ودوات وغیرہ پہنچنے سے پیشتر آنحضرت کے حواس وقویٰ کاروبار سے دست برداری اختیار کرلی۔اس حدیث کو ابن عباس نے بیان کیا ہے لیکن مسلم وبخاری دونوں نے اس کی تائید کی ہے۔ چونکہ اس حدیث کے بارے میں سنی وشیعہ باہم متفق نہیں ہیں اسلئے ہم اس کی صحت ودرستی کے حق میں فیصلہ دینے کی کوشش نہیں کرینگے لیکن ایسی احادیث کا وجود اور پھر بڑے بڑے محدثین کا ان کی تائید کرنا بیشک کچھ معنی رکھتاہے۔خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ان کے متعلق کوئی انہونی بات نظر نہیں آتی۔ حضرت محمد کے زمانہ کے اہلِ عرب میں لکھنا غیر معمولی نہیں تھا۔ یہ بات خوب مشہور ہے کہ جب بعض مکہ والوں کو اہالیان مدینہ نے اسیر کرلیا تومکہ والوں نے ان کو لکھنا سکھا کر اس کی اجرت میں آزادی حاصل کی۔ سبع معلقات کا وجود ہی (خواہ وہ جیسا کہ السیوطی ممکن خیال کرتا ہے کعبہ میں لٹکائے ہوئے تھے خواہ ابو جعفر احمد ابن اسماعیل النخاس کے بیان کے مطابق شاہِ عکاظ کے خزانہ میں رکھے تھے)صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانہ میں اوراس سے پیشتر اہلِ عرب کا عام دستور تھا کہ اپنی تصانیف اوراپنے نتائج طبع کو قلمبند کرلیا کرتے تھے۔ لیکن اگرچہ ہم یہ مان بھی لیں کہ حضرت محمد کی خود بہت لکھنے کی عادت نہیں تھی تو بھی احادیث سے صاف عیاں ہے کہ زید ابن ثابت آنحضرت کے بہت سے کاتبوں میں سے ایک تھا۔ جن آیات کو حضرت محمد نے لکھا یا وہ بھیڑ بکری کی شانہ کی ہڈیوں، لکڑی کے ٹکڑوں اور دیگر ممکن الحصول لکھنے کی چیزوں پر مرقوم تھیں۔ کوئی حروف اعراب وغیرہ کے بغیر ہی استعمال ہوتے تھے۔ زمانہ مابعد میں اس ناقص کوفی املاو تحریر کے سبب سے جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے بہت سا اختلاف قرات پیدا ہوگیا۔ ان اوراق کا مصنف یہ تو نہیں جانتا کہ کوفی حروف وہی تھے یا نہیں جن میں آسمان پر قرآن لوح محفوظ پر لکھا ہوا خیال کیا گیا ہے لیکن چونکہ یہ حروف سریانی حروف سے مشتق ہیں اس لئے بہت قدیم نہیں ہیں۔

جب کوئی آیت حضرت محمد لکھوادیتے تھے تو دیندار مسلمان اس کو فوراً حفظ کرلیتے تھے لیکن اگر ہم احادیث کے بیان کی بھی کچھ قدر کریں تو معلوم

ہوتا ہے کہ بعض اوقات بعض آیات لکھوانے اور حفظ کی جانے سے پہلے ہی گم ہوجاتی تھیں۔مثلاًمشکوۃ المصابیح میں مسلم محدث بیان کرتاہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا" نازل[1] شدہ قرآن میں دس مشہور آیات تھیں جن میں چوسنا منع تھا۔ پھر ویسی ہی پانچ آیتوں سے وہ منسوخ ہوگئیں۔ پھر رسول اللہ وفات پاگئے اور جو کچھ قرآن سے پڑھا جاتا ہے اس میں وہ شامل ہیں"۔ صاف ظاہر ہے کہ جب حضرت عائشہ نے یہ کہا اس وقت بعض قاری جنہوں نے ابھی منسوخ ہونے کی خبر نہیں سنی تھی ان آیات کو بھی پڑھتے تھے لیکن اب قرآن کے موجودہ متن میں وہ آیات نہیں ہیں۔مسلم بیان کرتاہے کہ حضرت عمر نے فرمایا" یقیناً[2] خدا نے محمد کو سچائی کے ساتھ بھیجا اور اس پر کتاب نازل فرمائی جس کے مطابق آیت الرجم اس میں شامل تھی جو کچھ خدا نے نازل فرمایا۔ رسول اللہ نے پتھر مارے اوراس کے بعد ہم نے پتھر مارے اور کتاب اللہ میں سنگسار کیا جانا زانی کی سزا ہے"۔آیت الرجم کے الفاظ یہ تھے" والشیخ[3] والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ" یعنی اور بوڑھا آدمی اور بوڑھی عورت اگر انہوں نے زنا کیا ہو تو ضرور سنگسار کئے جائیں۔ لیکن اب یہ آیت متن قرآن سے خارج ہے۔اب اس کے عوض میں سورہ نور کی پہلی پانچ آیات میں جرُم زنا کے لئے سو کوڑوں کی سزا مقرر ہے۔ ایک مقام پر ابن ماجہ بیان کرتا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا" چوسنے اور سنگسار کرنے کی آیات نازل ہوئی تھیں ۔۔۔۔اور مسودہ میرے بستر کے نیچے تھا۔ پس جب رسول اللہ نے وفات پائی اور ہم ان کی تجہیز وتکفین میں

[1] مشکواۃ کتاب النکاح صفحہ ۲۶۵

[2] مشکواۃ کتاب الحدود صفحہ ۳۰۱

[3] اہل عرب کے نزدیک آدمی پچاس سال کی عمر کو پہنچ کر شیخ بنتا ہے۔

مشغول تھے توایک پلاہوا جانور اندر آیا اوراس مسودہ کو کھا گیا"۔ مسلم سے روایت ہے کہ ابوموسیٰ الاشعری نے بصرہ کے پانچسو قاریانِ قرآن کی جماعت سے یوں کہا" تحقیق ہم ایک سورہ پڑھا کرتے تھے جس کو ہم طوالت ودقت کے لحاظ سورۃ براءہ[4] سے مشابہ کرتے تھے اور مجھے وہ سورۃ فراموش ہوگئی ہے ۔ فقط یہ الفاظ یادہیں توکلتم وغیرہ۔ اورہم ایک سورۃ پڑھا کرتے تھے جس کو ہم سورہ تسبیحات سے تشبیہ دیا کرتے تھے اوراب مجھے وہ یاد نہیں رہی۔ فقط یہ الفاظ یاد ہیں یا یھا الذین وغیرہ۔

یہ بھی ایک مشہور حقیقت ہے کہ اُبے نے اپنے قرآن میں چھوٹی چھوٹی دو اور سورتیں زائد کی تھیں جو سورۃ الخلا اور سورۃ الحفد کہلاتی تھیں (ان میں سے مواخرالذکر کو سورۃ القنوط بھی کہتے تھے) کیونکہ وہ کہتا تھا کہ یہ سورتیں اصل قرآن میں تھیں لیکن حضرت عثمان نے ان کو خارج کردیا۔ بخلاف اسکے ابن مسعود اپنے قرآن سے سورۃ الفاتحہ وسورۃ الفلق وسورۃ الناس کو خارج کردیا تھا۔ شیعہ صاحبان کہتے ہیں کہ موجودہ متن قرآن سے سورہ نسا کی ۱۳۶ ویں اور ۱۶۴ ویں آیت سے بعض الفاظ جو حضرت علی کے حق میں تھے قصداً خارج کردئے گئے ہیں ۔وہ کہتے ہیں کہ سورہ آل عمران کی ۱۰۶ ویں آیت میں لفظ ائمۃٍ کی جگہ اُمۃٍ درج کردیا گیاہے اور سورہ فرقان کی ۷۴ویں آیت میں اب یوں مرقوم ہے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا یعنی اور بنا ہم کو متقیوں کے لئے امام۔ لیکن اصل میں یوں تھا واجعل لنا من المتقین اماماً یعنی بنا ہمارے لئے متقیوں میں سے امام۔ وہ علاوہ بریں کہتے ہیں اور بھی بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ مثلاً سورہ رعد کی

[4] سورۃ توبہ کا دوسرا نام ہے جس میں ۱۳۰ آیات ہیں۔

بارھویں آیت سورہ مومنون کی ۳۹ویں آیت میں۔ امام فخر الدین رازی اس روایت کی صحت ودرستی کے لئے امکان کو تسلیم کرتا ہے کہ حضرت علی کے قرآن میں سورہ ھود کی ۱۸ویں آیت کے موجودہ الفاظ وَيَتْلُوهُ[1] شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَى إِمَامًا وَرَحْمَةً کی جگہ یوں مرقوم تھا ویتلوہ[2] شاھدً منہ ماماً ورحمۃ ومن قبلہ کتاب موسیٰ۔ معانی میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ شیعہ صاحبان کہتے ہیں کہ اس آیت میں شاھد سے حضرت علی مراد ہیں اوراس دوسری قرات کے مطابق ہدایت ورحمت حضرت علی ہی کے حق میں سمجھا جائیگا نہ کہ توریتِ موسیٰ کے حق میں علاوہ بریں بعض کہتے ہیں کہ ایک پوری سورۃ یعنی سورۃ النورین دیدہ ودانستہ قصداً قرآن سے خارج کردی گئی ہے۔ اس سورۃ کو میرزا محسن الفانی ساکن کشمیر نے اپنی کتاب دبستان مذاہب کے صفحہ ۲۲۰، ۲۲۱ پر تماماً اول سے آخر تک درج کیا ہے۔

اب بعض نے یہ بیان کیاہے کہ حضرت محمد کی وفات کے بعد قرآن کے متن کی اصل عبارت سے کچھ حصہ خارج کردیا گیا ہے اور کچھ آیات اور سورتیں زائد کردی گئی ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ان بیانات کی صحت وصداقت کے باب میں اپنی رائے ظاہر کریں لیکن چونکہ اس امر کی تحقیق کررہے ہیں کہ قرآن حضرت محمد کی رسالت اوران کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت ہے یا نہیں لہذا اس حقیقت سے واقفیت حاصل کرنا ہمارا فرض ہے ۔ کہ ایسے بیانات بڑے بڑے علمای اسلام نے کئے ہیں اوران کا ثبوت بھی دیا ہے۔

---

[1] اوراس کی طرف ایک شاہد اس کو پڑھتا ہے اوراس سے پہلے ہے موسیٰ کی کتاب ہدایت ورحمت۔

[2] اوراس کا ایک شاہد جو ہدایت ورحمت ہے اس کو پڑھتا ہے اور اس سے پہلے ہے موسیٰ کی کتاب۔

اب ہم کو یہ دریافت کرنا ہے کہ قرآن کی متفرق آیات وسورتیں کس طریقہ سے ایک کتاب کی صورت میں جمع کی گئیں۔اس معاملہ میں بھی ہم فقط علمایِ اسلام ہی کے بیانات پیش کرینگے۔

البخاری کا بیان ہے کہ حضرت محمد کی وفات کے قریباً ایک سال بعد پہلے پہل زید ابن ثابت نے خلیفہ ابوبکر کے حکم سے قرآن کو جمع کیا۔ زید[3] کا اپنا بیان البخاری یوں نقل کرتاہے" یمامہ میں قتلِ عام کے ایام میں ابوبکر نے مجھے بلوایا اورمیں کیا دیکھتا ہوں کہ عمر ابن الخطاب بھی اس کے پاس ہے۔ ابوبکر نے کہا عمر نے آکر مجھ سے کہاہے کہ یمامہ کے روز بیشک قرآن کے قاریوں کے درمیان سخت[4] قتل ہوا ہے اورمجھے اندیشہ ہے کہ میدانِ جنگ میں بہت سے قاری مارے گئے ہیں لہذا کتاب کا بہت سا حصہ مفقود ہورہا ہے اورمیں خیال کرتا ہوں کہ تجھے قرآن کو جمع کرنے کا حکم کرنا چاہیے ۔میں نے عمر سے کہا جو رسول اللہ نے نہیں کیا تم کیسے کروگے ؟ عمر نے کہا واللہ یہ نیک کام ہے اور عمر بار بار مجھ کو ترغیب دیتا رہا یہاں تک کہ آخر کار اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے مجھے انشراحِ صدر عطافرمایا اور میں عمر کے ساتھ متفق الرای ہوں۔ ابوبکر نے کہا توہوشیار نوجوان ہے اورہم تجھ پر اعتماد رکھتے ہیں اور تو رسول اللہ کے لئے وحی کا کلام لکھا کرتا تھا۔ پس قرآن کی متفرق آیات اور سورتوں کی تلاش کراوران کو جمع کر اور بخدا اگروہ مجھ کو پہاڑوں کو اٹھادینے کا حکم دیتا تووہ میرے لئے قرآن جمع کرنے کے کام سے مشکل نہ ہوتا۔ میں نے کہا وہ کام کیسے کروگے جو کہ رسول اللہ نے نہیں کیا؟ اس نے کہا بخدا یہ کام نیک ہے۔ چنانچہ ابوبکر بار بار

---

[3] مشکواۃ المصابیح صفحہ ۱۸۵

[4] کہتے ہیں کہ ۷۰۰ مارے گئے۔

مجھ کو ترغیب دیتا رہا یہاں تک کہ خدا نے مجھ کو وہی بات سمجھادی جو عمر اورابوبکر کو سمجھائی تھی۔ پس میں نے قرآن کی تلاش کی اور میں نے اس کو کھجور کی بے برگ شاخوں اور سفید پتھروں اور آدمیوں کے سینوں سے فراہم کیا۔ یہاں تک کہ میں نے سورہ توبہ کے آخر میں لَقَدْ جَاءكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ سے لے کر آخر تک عبارت ابو خزیمہ انصاری کے پاس پائی اور یہ عبارت مجھے اور کسی کے پاس نہ ملی اور مسودے ابوبکر کے پاس تھے جب تک وہ زندہ رہا۔ پھر عمر کے آخری دم تک اس کے پاس رہے اور پھر عمر کی بیٹی حفصہ کے پاس" آخری جملہ کے سواالسیوطی[1] کا بیان بھی بالکل یہی ہے۔

غالباً زید نے قرآن کی یہی مندرجہ بالاجلد تیار کی تھی اوراسکے سوا قرآن کا کوئی اور مکمل نسخہ کہیں بھی موجود نہ تھا۔ لہذا وہ میرے مسلمانوں کے قرآنی علم کا دارومدار جب تک انہوں نے چند حصے لکھوانہ لئے بالکل روایات پر تھا کیونکہ قرآن کو ان کی زبانی ہی زبانی پہنچتا تھا اور وہ بھی ہفت قرات مختلفہ میں۔ اس لئے اس امر کا اندیشا تھا کہ کہیں متن قرآن اس قدر خراب نہ ہوجائے کہ قابلِ اعتماد نہ رہے۔ لہذا جب حضرت عثمان تسخیر ارمن وآذربایجان میں مشغول تھے حذیفہ ابن الیمان نے ان کو اس خطرہ سے آگاہ کردیا۔ چنانچہ بخاری[2] کا بیان حسب ذیل ہے" اس لئے حذیفہ نے عثمان سے کہا اے امیر المومنین ان لوگوں کو روک پیش ازآنکہ یہ بھی یہود ونصاریٰ کی مانند کتاب کے بارے میں باہم اختلاف رکھنے لگیں۔ چنانچہ عثمان نے حفصہ کو کہلا بھیجا کہ مسودے ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم ان کی متعدد نقلیں تیار کرلیں۔ پھر ہم وہ تمہارے

---

[1] تاریخ الخلفا مطبوعہ لاہور ۱۳۰۴ ہجری صفحہ ۵۳

[2] مشکوٰۃ صفحہ ۱۸۵، بخاری نے یہ خبر انس ابن مالک سے سنی تھی۔

پاس واپس بھیج دینگے۔ اس لئے حفصہ نے ان کو عثمان کے پاس بھیج دیا۔ تب اس نے زید ابن ثابت اور عبد اللہ بن الزبیر اور سعید ابن العاص اور عبداللہ ابن حارث ابن ہشام کو حکم دیا اورانہوں نے نقل کی اور عثمان نے تین قریشیوں سے کہا جب تم میں اور زید ابن ثابت میں قرآن کی کسی عبارت کے بارے میں اختلاف رائے ہو تو تم اسے قریشی محاورہ کے مطابق لکھنا کیونکہ قرآن قریش ہی زبان میں نازل ہوا ہے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ جب وہ نقل کرچکے تو عثمان نے پرانے مسودے حفصہ کے پاس واپس بھیج دئے اور جو کچھ انہوں نے نقل کیا تھا اس کا ایک ایک نسخہ اس نے تمام ممالک میں بھیجدیا کہ اس کے سوا قرآن کا جو نسخہ وصحیفہ یا ورق پایا جائے جلادیا جائے۔ ابن شہاب نے کہا خارجہ ابن زید ثابت نے مجھے بتایا کہ اس نے زید ابن ثابت سے یہ سنا کہ جب ہم قرآن نقل کررہے تھے تو سورہ احزاب کی ایک آیت جو میں رسول اللہ کو پڑھتے سنا کرتا تھا غائب تھی۔ لہذا ہم نے اس آیت کی تلاش کی اور ہم نے اسے خزیمہ ابن ثابت انصاری کے پاس پایا جو کہ ان مومن بندوں میں سے تھا جو خدا کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہے۔ لہذا ہم نے اس آیت کو اس سورۃ میں داخل کرلیا" ۔

اس سے صاف عیاں ہے کہ جو قرآن تصحیح کے بعد حضرت عثمان نے جاری کیا اس میں اور حفصہ والے پہلے اصلی مسودوں میں کچھ اختلاف ضرور موجود تھا۔اس بات کا ثبوت کہ حفصہ والے پرانے نسخہ اورنئے عثمانی نسخہ قرآن میں بعض باتوں کے لحاظ سے اختلاف موجود تھا اس حقیقت سے بھی بہم پہنچتا ہے کہ تھوڑا ہی عرصہ بعد جب مروان مدینہ کا حاکم ہوا تو اس نے حفصہ والا نسخہ بھی جلادیا۔ لیکن باوجودیکہ متن قرآن سے اختلاف قرات کو رفع ودفع کرنے

کے لئے ایسی سخت کوششیں کی گئیں تو بھی بعض اختلافات اب تک موجود ہیں جیسا کہ بیضاوی کے بیان سے ظاہر ہے (دیکھو تفسیر بیضاوی برسورہ آل عمران ۱۰۰ ویں آیت، سورہ انعام ۹۱ ویں آیت، سورہ مریم ۳۵ ویں آیت۔ سورہ قصص ۴۸ ویں آیت سورہ احزاب چھٹی آیت۔ سورہ سباء ۱۸ ویں آیت اور سورہ ص میں ۲۲ ویں آیت وغیرہ)۔

بخلاف اس کے سورہ احزاب میں ۳۷، ۳۸، ۴۹ سے ۵۲ تک کی آیات کا وجود یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لئے ایک خاص الخاص دلیل ہے کہ متن قرآن قریباً ویسا ہی ہے جیسا کہ حضرت محمد چھوڑ گئے تھے کیونکہ ان آیات میں ایسی باتیں مندرج ہیں جن سے حضرت محمد کے اخلاق اورچال چلن کی حقیقت عیاں ہوجاتی ہے۔ یہ خیال کرنا بالکل ناممکن ہے کہ اگرآنحضرت خودان آیات کو پڑھ کر نہ سناتے اور جزو قرآن نہ بتاتے توان کے مومنین میں سے کبھی کوئی یہ جرات کرتا کہ ان آیات کو گھڑ کر اپنے آقا کی ایسی تصویر کھینچتا۔ جس وقوعہ کا ۳۷ویں اور ۳۸ویں آیت میں ذکر ہے اس کو حضرت محمد کے ہر ایک سوانح نویس نے لکھا ہے۔ لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے میں کوئی چیز ان آیات سے بڑھ کر کارگر نہیں ہوئی۔

زمانہ حال کے تعلیم یافتہ روشن ضمیر مسلمانوں کے لئے ان آیات کو کسی اچھی صورت میں پیش کرنا ناممکن ہے۔ ان کے علما کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن معجزہ ہے اور قرآن کا فصیح وبلیغ طرز بیان ہی حضرت محمد کی نبوت ورسالت کا کافی ثبوت ہے اور سورہ ہای مندرجہ قرآن میں سے کسی ایک کی مانند ایک سورۃ بنانے پر بھی نہ بنی آدم قادر ہیں نہ فرشتگان وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا ہر ایک لفظ پیدائش عالم سے بہت عرصہ پیشتر آسمان پر قلم نے لوحِ محفوظ پر لکھ دیا تھا اور لاکلام یہ آیات بھی باقی کے ساتھ ہی لکھی گئی تھیں۔ شب قدر میں جبرائیل فرشتہ قرآن کو اس الہیٰ اصل سے نچلے آسمان پر لایا۔ پھر حسب موقع حضرت محمد کو سکھایا۔ لہذا ابن خلدون کہتا ہے" اس لئے[1] جان لے کہ قرآن اہلِ عرب کی زبان میں نازل ہوا اوران کے فصیح طرز بیان میں آیا اورانہوں نے اس کے مختلف حصول کے معانی کو اوران حصوں کے باہمی تعلقات کو خوب سمجھا اور قرآن تھوڑا تھوڑا کرکے توحید الہیٰ کی تعلیم وتلقین اور دینی فرائض کی ضروریاتِ زمانہ کے مطابق تفہیم کے نازل ہوتا رہا۔ بعض آیات میں عقائد ومسائل دین اور بعض میں اصلاح اخلاق کے لئے احکام وقواعد مندرج ہیں"۔ پھر ایک اور مقام پر وہ یوں لکھتاہے" یہ سب[2] تیرے لئے اس امر کا ثبوت ہے کہ تمام آسمانی والہامی کتابوں میں فقط قرآن ہی جو ہمارے بنی پر نازل ہوا ایسا ہے جو اصلی الفاظ اور وضع میں سنا گیا ہے۔ بخلاف اس کے توریت وانجیل اور تمام دیگر کتبِ آسمانی کا انبیاء پر عالمِ محویت ومجذوبیت میں خیالات کی صورت میں القا ہو اورانہوں نے انسان کے معمولی ہوش وحواس میں واپس آکر ان کامطلب اپنی معمولی بول چال میں بیان کیا لہذا انہوں ان کے متعلق معجزانہ کچھ بھی نہیں ہے"۔ لہذا اس علامہ مصنف کے خیال کے مطابق قرآن کی زبان اور تعلیم دونوں بلاواسطہ الہیٰ زبان والہیٰ تعلیم ہیں درحالیکہ عہدِ عتیق وجدید کی نہ فقط زبان ووضع بلکہ تعلیم بھی القا سے بڑھ کر نہیں ہے۔ پس اب اگرہماری تحقیق کا نتیجہ یہ ہو کہ قرآن کا طرز بیان معجزانہ نہیں یا اس کا اعجاز ثابت نہیں ہوسکتا تو اسکا یوں جواب دینا معقول نہیں ہوگا کہ بائبل کا طرزِ بیان بھی معجزانہ

---

[1] ابن خلدون جلد دوم صفحہ ۳۹۱

[2] ابن خلدون جلد اول صفحہ ۱۷۱، ۱۷۲

نہیں ہے اوراس سے کتب مقدسہ کا الہامی ہونا بھی ثابت نہیں ہوتا۔ ہم مسیحیوں کا تو یہ دعویٰ ہی نہیں ہے کہ کتب مقدسہ کے طرزِ کلام سے ان کے الہامی ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور ابن خلدون کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اس کے زمانہ میں بھی مسیحیوں نے کوئی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ بائبل کے ہر ایک لکھنے والے نے اپنی معمولی زبان استعمال کی ہے اور اسی واسطے بعض نے اعلیٰ درجہ کی شستہ نظم میں لکھا ہے اور بعض نے سادہ نثر میں۔ پیغام و تعلیم خدا کی طرف سے ہے لیکن اس کو انسانی زبان کے لباس سے ملبس کرنا نبی ورسول ، زبور نویس ، انجیل نویس اور مورخ کا کام ہے جس کو خدا نے لکھنے کے لئے مقرر کیا۔

بیشک اہلِ علم جانتے ہیں کہ قریشی بولی پرانی مکی زبان ہے لیکن وہ اس کو فردوس کی بولی تسلیم نہیں کرتے۔ عربی زبان شامی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس کے ساتھ کی اورشامی زبانیں عبرانی وارضی وحبشی وسریانی وغیرہ ہیں ۔ جواس سے کم درجہ کی ہیں ۔ عربی نہایت قدیم اور بہت اچھی زبان ہے۔ قریش کا محاورہ تمام دیگر عربی محاوروں سے زیادہ شستہ ہے اور تمام علما بالا اتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کے بعض حصوں کی زبان نہایت شستہ وفصیح ہے لیکن وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ قرآن میں بعض غیر عربی الفاظ موجود ہیں جودوسری زبانوں سے لے کر عربی بنا لئے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اشخاص ومقامات کے نام ہیں ۔ فرعون قدیمی مصری سے مشتق ہے۔ ادم وعدن ایک نہایت پرانی زبان سے جو اکدین کہلاتی تھی ماخوذ ہیں ۔ ابراہیم اسیرین سے اور ہاروت وماروت وصراط وحور وجن وفردوس قدیم فارسی سے لئے گئے ہیں۔ تابوت وطاعوت اور زکواۃ وملکوت سریانی ہیں۔ حواری حبشی ہے اور جروسکینہ وماعون وتوریت وجھم عبرانی ہیں اورلفظ انجیل ایک یونانی لفظ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ لہذا قرآن کی زبان بالکل خالص عربی نہیں ہے۔ اگر عربی لفظ لوح محفوظ پر مرقوم تھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی جو عبرانی ویونانی اکدین وحبشی اور فارسی الفاظ کےلکھے جانے کی مانع ہوتی۔ لیکن ہمارے نزدیک عربی تحریر ثبوت کی محتاج ہے۔

علاوہ برین قرآن کی عبارت میں چند جملوں کی ساخت ایسی ہے کہ اگر وہ قرآن سے باہر کسی اور کتاب میں پائی جائے تو غلط سمجھی جائیگی۔ ایسے جملے بکثرت نہیں ہیں۔ ہم فقط تین[1] ہی پیش کرنے پر اکتفا کرینگے۔(۱)اول سورۃ البقرہ کی ۱۹۲ ویں آیت میں مرقوم ہے کہ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ(۲) دوم سورۃ الرعد کی ۲۸ویں آیت میں مسطور ہے الْقُلُوبُ الَّذِينَ (۳)سوم سورۃ طہ کی ۶۶ویں آیت میں مندرج ہے إِنْ هَذَانِ لَسَاحِرَانِ۔

علاوہ بریں بے تعصب ومنصف مزاج عربی دان اصحاب کی یہ عالمگیر رای نہیں ہے اور وہ سب متفق ہیں کہ قرآن کی فصاحت[2] وبلاغت تمام دیگر عربی کتب سے بڑھ کر ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ قرآن کی عربی سبع معلقات اورمقامات حریری کی عربی سے زیادہ فصیح وبلیغ نہیں ہے۔ اگرچہ اسلامی ممالک میں بہت ہی کم مسلمانوں کو ایسے خیال کے اظہار کی ہمت ہوتی ہے تو بھی تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب میں بھی ایسے عالم ہوگذرے ہیں جنہوں نے قرآن کو فصاحت میں بے نظیر ماننے سے انکار کیا ہے۔چنانچہ سلطان

[1] دیگر عیوب عبارت منار الحق میں بتائے گئے ہیں ۔ دیکھو عربی ایڈیشن اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۸۹۴ء صفحہ ۱۴، ۱۶

[2] دیکھو مقالہ فی الاسلام کا ضمیمہ محاورہ قرآن کے بارے میں۔

اسماعیل اپنی تواریخ کے اس حصہ میں جس میں اسلامی معاملات کا ذکر کرتاہے بتاتاہے کہ عیسیٰ ابن صبیح المعروف ابوموسیٰ مزدار جو مزدار یہ فرقہ کا بانی ہے کہا کرتا تھا کہ ایسے آدمی موجود ہیں جو فصاحت و بلاغت اور نظمی خوبیوں میں قرآن کی مانند کتاب تصنیف کرسکتے ہیں ۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ قرآن مخلوق ہے یعنی بنایا گیا ہے اور اس مسئلہ پر خلیفہ المامون کے عہدِ سلطنت میں سخت مباحثات وقوع میں آئے (۱۹۸ ھجری سے ۲۱۸ ھجری) تک مطابق (۸۱۳ء سے ۸۳۳ء) شرح المواقف کا مصنف لکھتاہے کہ مزدار کہا کرتا تھا کہ اہلِ عرب فوراً ایک ایسی کتاب تصنیف کرسکتے تھے جو قرآن سے زیادہ فصیح وبلیغ اور بہتر ہوتی ۔ الشہرستانی بیان کرتا ہے کہ مزدار نے قرآن کے فصاحت وبلاغت میں بے نظیر ہونے کے دعویٰ کو رد کردیا۔ النظام کہتا ہے کہ اعجازِ قرآن ماضی واستقبال کی اخبار کے بیان کرنے میں ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر قرآن کسی دوسری کتاب کے دعاوی کی سماعت کی اجازت ہی نہیں دیتا اور اہلِ عرب کو ایسی کوشش میں مستعدی کے ساتھ مشغول ومصروف ہونے سے جبراً روکتا ہے چنانچہ اس کا خیال ہے کہ اگر اہل عرب کو ایسی کوشش کرنے کی اجازت مل جاتی ہے تو وہ ضرور ایسی سورتیں تصنیف کردکھاتے جو فصاحت وبلاغت اور نظم میں سورہ ہای قرآن کی مانند ہوتیں۔ بیشک بہت سے مسلمان ایسے خیالات کو بدعت خیال کرتے ہیں اور ان اوراق کے مصنف کی ہرگز یہ خواہش نہیں کہ ان خیالات کی تائید کرے۔ وہ فقط یہ دکھلانا چاہتاہے کہ قرآن کا بے نظیر وبیمال ہونا جس کو اکثر مسلمان ہمیشہ ایک امر مسلمہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں اسے بعض عربی علما نے بھی تسلیم نہیں کیا پس اگر قرآن کا طرز بیان ان علما کی نظر میں معجزانہ اور حضرت محمد کی نبوت اور رسالت کا کافی ثبوت نہیں ٹھہرا تو کچھ تعجب کی بات نہیں کہ جن لوگوں کو عربی زبان کا علم ہے ان کے نزدیک اس دلیل کی مضبوطی واستحکام کا ثبوت بہم نہیں پہنچا۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قرآن کا طرز بیان تمام دیگر کتب عربی کے طرز بیان سے اعلیٰ وافضل ہے تو اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن الہامی ہے یا حضرت محمد پر آسمان سے نازل ہوا۔ ہر ایک مہذب وشائستہ زبان میں بعض کتابیں ایسی پائی جاتی ہیں جو بے نظیر ہوتی ہیں۔ انگریزی زبان میں کوئی ناٹک نویس شیکسپئیر کی برابری نہیں کرسکتا۔ جرمنی میں گاتھے اور شلر اپنے ناٹکوں میں بے نظیر ہیں۔ فارسی میں خواجہ شمس الدین حافظ ایک خاص قسم کی شاعری میں بے ہمال ہے اور مولانا رومی ایک اور قسم کی نظم میں۔ سنسکرت میں اب بھی کوئی ایسی نظم لکھنے کی قدرت نہیں رکھتا جیسی کہ رگوید میں موجود ہیں۔ تو بھی محض اس بنا پر کہ ان کتابوں میں سے ہر ایک اپنے طرز بیان اور زبان میں بے نظیر ہے ان کو الہامی قرار دینا بالکل نامعقول ہے۔ ہم کو کتاب کی مندرجہ تعلیم کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے ۔ طرز بیان کے مطابق فیصلہ کرنا درست نہیں ہے ورنہ اہلِ ہنود کا رگوید کو الہامی قرار دینا ۔ صحیح ٹھہریگا اگرچہ اس میں ۳۳ خداؤں کا ذکر ہے۔ الہامی کتاب میں ہم مشتہ زبان و فصیح طرز بیان کے مداح ہوسکتے ہیں ۔ لیکن سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ضروری چیز اس کتاب کی سچی تعلیمات ہیں۔ اس زمانہ میں بھی کوئی دینی کتاب قابل قدر خیال نہیں کی جاتی جب تک کہ اس کی تعلیمات ناقص اور ناقابل اعتماد ہیں اگرچہ اس کی زبان کی کتنی ہی شستہ اور طرز بیان کیسا ہی فصیح وبلیغ ہو۔

اگر کوئی یوں کہے کہ قرآن دنیا کی ہر ایک زبان کی ہر ایک کتاب سے زیادہ فصیح وبلیغ ہے اور محاسنِ نظم پُر ہے تو یہ دعویٰ بالکل بے دلیل ہے۔ یہ

دعویٰ کسی شخص کے سامنے پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا اور وہ اس کی صداقت کو ہر گز نہیں پاسکتا جب تک دنیا کی تمام قدیم وجدید زبانوں میں کامل مہارت حاصل کرکے۔ ہرایک قدیم وجدید کتاب کو بغور نہ پڑھ لے۔ رویِ زمین پر کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا کیونکہ یہ انسانی طاقت سے بڑھ کر اور حدِ بشر سے باہر ہے۔ لہذا اہل اسلام کا یہ کہنا معقول نہیں کہ ان کا دین نوروہدایت ہے اور تمام بنی آدم کے لئے اسے قبول کرنا ضرور ہے جبکہ اسلام کی صداقت اور حضرت محمد کی نبوت ورسالت کی سب سے بڑی دلیل جو وہ پیش کرتے ہیں ایسی ہے کہ کسی حالت وصورت میں بھی اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاسکتا۔ یہ بالکل ایسا ہی جیسا کوئی اندھا کسی دوسرے اندھے سے کہے کہ تمہاری نجات کا دارومدار اس پر ہے کہ تم قوس قزح کے تمام رنگوں میں خوب امتیاز کرسکو اور کرلو۔ کیونکہ نہ اہلِ اسلام ہی دنیا کی تمام زبانوں کو جانتے ہیں اور نہ ہم اور نہ ہم میں سے کسی فریق نے دنیا کی تمام کتابوں کو پڑھا ہے لہذا جو ثبوت ودلیل وہ پیش کرتے ہیں وہ بالکل بے حقیقت اوران کے لئے اور ہمارے لئے بے سود ہے۔

ہم دنیا کی سب زبانیں تو نہیں سیکھ سکتے لیکن ان میں سے بعض جو سب سے زیادہ ضروری اور قابلِ قدر ہیں سیکھ کر پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ جب ہم عہدِ عتیق کی اصلی عبرانی زبان میں پڑھتے ہیں مثلاً یسعیاہ اور استثنا وزبور کو تو بہت سے علما کی یہ رائے ہے کہ ان کتابوں کی عبارت ایسی فصیح وبلیغ ہے کہ قرآن کے کسی حصہ میں ایسی پرُفصاحت عبارت نہیں ملتی۔غالباً مسلمانوں کے سوا بمشکل ہی کوئی اس حقیقت کا انکار کریگا اور اگر کوئی مسلمان عربی وعبرانی دونوں زبانوں کو اچھی طرح سے جانتا ہو تو وہ بھی اس سے انکار نہیں کرسکیگا۔ لیکن جو لوگ بڑے عالم نہیں ہیں وہ بھی اپنے لئے خود فیصلہ کرسکتے ہیں۔ اگر کوئی قرآن کے کسی چیدہ حصہ کا فارسی یا اردو یا تر کی ترجمہ پڑھے اور پھر اسی زبان میں یسعیاہ کے کسی حصہ کے ترجمہ سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ اپنی رائے قائم کرسکیگا کہ قرآن اپنے طرز بیان کی خوبی میں تمام دوسری کتابوں سے اعلیٰ وافضل ہے یا ایسا کہنا بالکل دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔

لیکن اگر یہ بات بالکل ثابت بھی ہوجائے اوراس میں کسی طرح کے شک وشبہ کا امکان نہ رہے کہ قرآن فصاحت وبلاغت اور شاعری میں تمام دیگر کتب سے اعلیٰ وافضل ہے تو اس سے بھی قرآن کا الہامی ہونا ایسا ہی ثابت ہوگا جیسا کوئی آدمی جسمانی طاقت سے دانا وحکیم ثابت ہوسکتا ہے اور کوئی عورت اپنی خوبصورتی سے پاکدامن ، باعصمت وعفت ثابت ہوتی ہے۔ اپنی تعلیمات واپنے نفیس مضمون کے وسیلہ سے اور تمہید کے مندرجہ معیاروں سے درست ثابت ہونے سے ہی کوئی کتاب الہامی قرار دی جاسکتی ہے ۔ افترا پرداز مانی نےکہا کہ لوگوں کومجھے پراقلیط ماننا چاہیے کیونکہ اس نے کتاب ارتنگ پیش کی جو خوبصورت تصویروں سے پرُتھی اورکہا کہ یہ کتاب خدا نے دی ہے اور کوئی انسان ایسی تصویریں نہیں بناسکتا جیسی کہ اس میں ہیں لہذا یہ بات اس کتاب کے من جانب اللہ ہونے کی صاف دلیل ہے۔ لیکن کوئی عقلمند مسلمان یا مسیحی اب یہ خیال نہیں کرتا کہ ان تصویروں کی خوبصورتی سے مانی نبی ثابت ہوا اگرچہ ان تصویروں سے وہ اچھا مصور ثابت ہوسکتا تھا۔اس کی کتاب تمام دیگر کتابوں کی طرح اپنی مندرجہ عبارات سے پرکھی گئی اور نتیجہ روی زمین سے نیست ونابود ہوگئی اور جس دین کی مانی نے تعلیم دی تھی اگرچہ ایک زمانہ میں اس کے ماننے والے بہت ہوگئے تھے لیکن اب تمام بنی آدم میں سے ایک بھی مانی کے مذہب کا پیرو نہیں ہے۔ کتاب کی ٹھیک جانچ اس کی مندرجہ تعلیمات

ہی کو دیکھنے سے ہوسکتی ہے ۔ لہذا آئندہ باب میں ہم قرآن کی مندرجہ تعلیمات پر غور کرینگے جیسا کہ پہلے بائبل کی تعلیمات پر کرچکے ہیں۔

# چوتھا باب

## تعلیماتِ مندرجہ قرآن کی تحقیق وتدقیق اس فیصلہ کی غرض سے کہ ان سے قرآن کا الہامی ہونا ثابت ہوتا ہے یا نہیں

یقینی طور پر یہ دریافت کرنے کے لئے کہ قرآن وحی الہیٰ ہے یا نہیں ہمیں قرآن کی مندرجہ تعلیمات کو بغور مطالعہ کرنا نہایت ضرور ہے ۔ محض یہی کافی نہیں کہ ہم اس کی طول طویل عبارات کو حفظ کریں اوران کا مطلب بالکل نہ سمجھیں ۔ ایسا کرنا طوطوں کا کام ہے۔ انسان کی شان کے شایاں نہیں۔ جن کا یہ اعتقادوایمان ہے کہ قرآن کلام اللہ اور بنی آدم کے لئے نورو ہدایت ہے ان کو یہ جاننا چاہیے کہ اگر قرآن ان کے دلوں اوران کی عقلوں کو روشن کردے تو تب ہی ایسا ہوسکتا ہے اوران کے دلوں اور عقلوں کو کیسے روشن ہوسکتا ہے جب تک وہ اس کے مطلب ومعانی کواچھی طرح سے نہ سمجھیں۔ نوراس لئے دیا جاتاہے کہ جہاں لوگ اس کو دیکھ سکیں وہاں رکھا جائے۔ وہم ونادانی کے نیچے چھپانے کے لئے نہیں ملتا۔ لہذا قرآن کو نہایت غوروفکر اور دعاومناجات کے ساتھ پڑھنا تمام اہل اسلام پر فرض ہے۔ اگر یہ کتاب خدا کا آخری کامل ترین الہام بھی ہے تو جو لوگ اس کو سمجھتے نہیں اور اس کی فرمانبرداری واطاعت نہیں کرتے ان کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا لیکن بہت سے مسلمان آیاتِ قرآن کو بلند آواز سے پڑھنے پر قانع ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کے لئے اوران کے مردوں کے لئے بہت سا ثواب جمع ہوسکتا ہے۔ وہ قرآن کو عربی زبان میں پڑھتے ہیں اگرچہ ان میں کثیر التعداد لوگ ایسے ہی ہیں جو اس قریشی بولی کو بالکل نہیں سمجھتے۔ جو کتاب خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ کرے اس کو اس طرح سے استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ ایسا کرنا ویسا ہی نامناسب ہے جیسا کسی مسافر کا اپنی مشعل کو کسی غار میں چھپادینا اور اپنی راہ دیکھنے میں اس سے مدد نہ لینا۔

چونکہ قرآن کے حق میں ایسے عظیم الشان دعاوی پیش کئے گئے ہیں اور چونکہ لازم وواجب ہے کہ کوئی انسان جلد بازی سے بے سوچے سمجھے کسی الہام الہیٰ کو رد نہ کرے لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذی ہوش مسیحی بھی قرآن کو مطالعہ کریں اور اس کی تعلیمات کا علم حاصل کریں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ قرآن کو رد کرنے میں نوروہدایت اور نجات کو پھینک دیں۔ جب مسیحی اورمسلمان مستعدی کے ساتھ اس کتاب کومطالعہ کرچکینگے تو بہتر طور سے ایک دوسرے کی تلاشِ حق میں اور راہ راست پرچلنے میں مدد کرسکینگے یعنی ان لوگوں کی راہ پر جن سے حق سبحانہ تعالیٰ خوش ہے نہ ان کی راہ جن سے وہ ناراض ہے اور نہ گمراہوں کی۔

تعلیماتِ مندرجہِ قرآن میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ تعلیم اللہ جل شانہ کی ذات وصفات کے باب میں ہے۔ یہ تعلیم اس ذات پاک کوازلی وابدی اور قادر مطلق وعالم الغیب اورہمہ دان بیان کرتی ہے ۔یہی تعلیم اس کو سمیع وبصیر ومتکلم بتاتی ہے اور زمین وآسمان کا خالق اور ایسا رحیم وکریم بیان کرتی ہے جو عادل ومہربان وقدوس اور موت وحیات پر قادر ہے جو تمام صفاتِ کاملہ کا جامع اورہر طرح کے نقص وعیب سے پاک ہے اوراس لئے کمزوری ونادانی اوربے

انصافی وتبدل اس کی ذاتِ جامع الصفات الکاملہ سے بالکل دُور ہیں۔ نیز قرآن بنی آدم کو توحید الہیٰ پر ایمان لانے کی طرف بلاتا ہے اور شرک وبت پرستی سے کلیتہً منع کرتا ہے اور قیامت پر اوراس دنیا کے نیک وبداعمال کی سزا وجزا پر ایمان لانے کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن فردوس اور آتش ودوزخ کا بھی بیان کرتا ہے اور جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصہ میں ہم بیان کرچکے ہیں عہدِ عتیق وجدید کے حق میں شہادت دیتا ہے۔ قرآن مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ تمام انبیاء پر ایمان لائیں اوران میں کسی طرح کا فرق نہ کریں۔ ریاکاری کی مذمت کرتا ہے اور بعض اشیا کو حلال اور بعض کو حرام ٹھہراتا ہے۔خون اور زنا اور چوری اور جھوٹی قسم کھانے سے منع کرتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف ہواور غریبوں کو خیرات دی جائے۔

ہر ایک شخص خواہ وہ مسیحی ہو یا مسلمان بلاتامل تسلیم کریگا کہ ایسی باتوں کے باب میں قرآن کی بہت سی تعلیم نیک ومفید ہے۔ تمام اچھی تعلیم انجام کارخدایِ رحیم ورحمان کی طرف سے ہے (کیونکہ تمام نیکی کا منبع وسرچشمہ وہی ہے)خواہ ہم کو وہ تعلیم انبیا ورسل کے وسیلہ سے ملے خواہ الہامی کتابوں اور عقل وضمیر کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقہ سے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ ہم حضرت محمد کے نبی ورسولِ الہیٰ ہونے کے دعویٰ کو تسلیم کریں ذیل کی دوباتوں میں سے ایک کا ثبوت ہونا ضرور ہے (۱) یہ کہ آنحضرت ہی بنی آدم میں سے پہلے تھے جنہوں نے توحیدِ الہیٰ کی عظیم الشان سچائی کی تعلیم دی۔ نیکی وبدی میں فرق بتایا ۔ گناہ کی آلودگی وناپاکی کو ظاہر کیا اور آئندہ زندگی کی سعادت وشقاوت کوظاہر فرمایا(۲) یہ کہ آنحضرت کی تعلیم ان امور پر اوران کے علاوہ دیگر باتوں کے بارے میں انبیایِ سلف کی تعلیم سے بہت ہی اعلیٰ وافضل تھی اوراس لئے لاریب تازہ الہام الہیٰ کا نتیجہ تھی لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جن حقائق کا ہم نے ذکر کیا ہے ان کی تعلیم دینا کے بہت سے حصوں میں پہلے ہی دی جاچکی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت محمد کی ولادت سے سینکڑوں سال پیشتر اہلِ عرب بھی ان حقائق کی تعلیم پاچکے تھے۔ عہدِ عتیق وجدید میں نہ فقط توحیدِ الہیٰ کی تعلیم دی گئی تھی بلکہ یہودی اور مسیحی دین کی بھی یہی بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ اور جس قدر حقائق کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ سب کے سب بائبل میں موجود ہیں۔ یہ تعلیم کہ خدای زمین وآسمان کا خالق ہے فارس کے بادشاہ دارا نے بھی دی تھی۔ یہ بات ان کتبوں سے ثابت ہوتی ہے جو دارا کوہِ بیستون اور استخ کی چٹانوں پر چھوڑ گیا ہے۔ یہ کتبے سنہ مسیحی سے ۵۰۰ سال اور حضرت محمد کی ولادت سے ۱۰۰۰ سال پیشتر کے ہیں۔ اگر اس ایک ہی عظیم تعلیم کے پہلے پہل دینے والے حضرت محمد ہوتے تو بالکل واجب طور سے نبی تسلیم کئے جاتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔آنحضرت کی ولادت سے پیشتر ہی اہلِ عرب اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے۔مکہ میں خانہ کعبہ بیت اللہ کہلاتا تھا اور لفظ اللہ میں ال توحید الہیٰ کی تعلیم پر دلالت کرتا تھا۔ حضرت محمد کے والد ماجد جو ان کی ولادت سے پہلے ہی وفات پاگئے ان کا نام عبداللہ تھا جس میں خدا کا نام شامل ہے اور توحیدِ الہیٰ پر ایمان کا ثبوت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ جاہلیت میں اہلِ عرب ادنیٰ درجہ کے اور معبودوں کی بھی پرستش کرتے تھے اور ان کو خدا کے حضور میں اپنی سفارش کرنے والے سمجھتے تھے اور ان معنوں میں ان کو ذاتِ باری تعالیٰ کے شریک گردانتے تھے ۔ لیکن بایںہمہ بُت پرست اہلِ عرب سے بھی عقیدہ وحدانیت بالکل مفقوداور نیست ونابود نہیں ہو گیا تھا۔اگر مفقود ہو بھی ہو گیا ہوتا تو آنحضرت ان یہودیوں ونصاریٰ سے سیکھ

سکتے تھے جو ان ایام میں عرب میں بودوباش رکھتے تھے۔ علاوہ بریں نبوت کا دعویٰ کرنے سے پیشتر کم از کم دوبار حضرت حضرت محمد نے سیریا کی سیر کی تھی۔ وہاں آنحضرت نے ان لوگوں سے ملاقات اور گفتگو کی جو سب کے سب مسیحی تھے۔ پہلی بار آپ نے اپنے عم عالیشان ابوطالب کے ساتھ گئے تھے جبکہ آپ کی عمر قریباً ۹ سال کی تھی اور دوسری بات آپ کی بی بی خدیجہ کے غلام میسرہ کے ساتھ گئے جبکہ آپ کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ آپ کے رشتہ داروں اور شخصی دوستوں میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو اس وقت یا پہلے یہودونصاریٰ تھے اور اس سے بڑھ کر آپ کی مصری لونڈی مریم تھی۔ مثلاً ورقہ ابن نوفل جو حُنفا میں مسیحی ہوگیا تھا اور توریت وانجیل دونوں سے واقف[1] تھا۔ ان میں سے ایک اور عثمان ابن حویرث تھا جس نے قسطنطنیہ میں قیصری دربار میں اصطباغ پایا تھا۔ ابن ہشام نے جو شجرہ ہای انساب دئے ہیں ان سے صاف عیاں ہے کہ ورقہ اور عثمان دونوں خدیجہ بی بی کے عمزاد بھائی تھے۔ ایک اور حنیف عبید اللہ ابن حجش مسلمان ہو کر اے بی سینیا کو گیا تھا لیکن وہاں جا کر وہ مسیحی ہوگیا تھا اور جب اس نے وفات پائی تو حضرت محمد نے اس کی بیوہ اُم حبیبہ سے نکاح کرلیا تھا۔ سلمان فارسی جو کہ آنحضرت کے اصحاب میں سے تھا اس کے بارے میں بعض کا بیان ہے کہ وہ پہلے مسوپتامیہ کا مسیحی تھا اور جب قید ہو کر فارس کو گیا تو وہاں اس نے زرتشتی دین اختیار کرلیا تھا اور زیادہ قرین قیاس رائے یہ ہے کہ وہ پیدائش ہی سے فارسی وزرتشتی تھا لیکن سیریا میں مسیحی ہوگیا تھا۔ پھر وہ عرب میں آکر مسلمان ہوا اور حضرت محمد کا بڑا عزیز و شخصی دوست بن گیا۔

[1] سیرۃ الرسول جلد اول صفحہ ۸۱، ۸۲

جب آنحضرت نے طائف پر لشکر کشی کی تو اسی نے آپ کو منجنیق استعمال کی کرنے کی ترغیب دی اور جب قریش نے اپنے مددگاروں سمیت ۵ ہجری میں مدینہ پر حملہ کیا تو اسی نے مدینہ کی حفاظت کے لئے گرداگرد خندق کھودنے کا صلاح دی۔ یہ ابن ہشام کا بیان ہے ۔ عبداللہ ابن سلام کے بارے میں بن اسحاق [2] لکھتا ہے کہ وہ مسلمان ہونے سے پہلے ایک عالم یہودی ربی (حبر) تھا ۔ عباسی اورجلالین اپنی تفاسیر میں لکھتے ہیں کہ سورہ احقاف کی نویں آیت میں قران اور یہودی کتب مقدسہ کے درمیان مطابقت وموافقت پر شاہد کا اشارہ اسی شخص کی طرف ہے۔ عباسی ایک مسیحی غلام یسار نامی کا ذکر کرتا ہے (جو ابوفقیہ بھی کہلاتا تھا) اورایک یونانی مسیحی کا جس کا عربی نام ابوتکیہہ تھا۔ حضرت محمد پر تصنیف وتالیف قرآن میں ان دونوں سے مدد لینے کا الزام لگایا گیا تھا جیسا کہ سورۃ الفرقان کی پانچویں اور چھٹی آیت میں مرقوم ہے۔ سورۃ النحل کے چودھویں رکوع کی تیسری آیت کی تفسیر میں عباسی نے لکھا ہے کہ اس مددومعاونت کا شبہ قابیل نامی ایک مسیحی پر تھا جو جلالین نے اس آیت پر اپنے حواشی میں یسارا اور حبر دو شخص بتائے ہیں ۔ بعض نے سلمان کا نام لیا ہے اور بعض نے صحیب کا اور بعض نے ادس نامی ایک راہب بتایا ہے۔ حضرت محمد کا متنبیٰ زید پیدائش سے سریانی تھا لہذا وہ بھی مسیحی تھا۔

جب ہم ان لاریب حقیقتوں پر غور کرتے ہیں تو یہ کہنا بالکل ناممکن ٹھہرتا ہے کہ قرآن کی یہ بڑی بڑی تعلیمات جو کہ بحیثیت مجموعی عہدِ عتیق وجدید کی تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہیں پہلے پہل حضرت محمد ہی کو قرانی وحی

[2] سیرۃ الرسول کی جلد اول صفحہ ۱۸۴ نیز دیکھو روضتہ الاحباب۔

آسمانی کے وسیلہ سے پہنچیں۔ لہذا ان کا قرآن میں پایا جانا اگرچہ بہت ہی اچھا ہے اور ہم کو ان کے لئے خدا کا شکر کرنا چاہیے تو بھی کسی طرح سے معجزہ نہیں ہے اور نہ قرآن کے الہامی ہونے اور حضرت محمد کے رسول اللہ ہونے کا ثبوت ہے۔

لیکن اکثر اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اس امر کا کامل ثبوت ان بے شمار پیشینگوئیوں میں ملتا ہے جو بعض مسلمانوں کے بیان کے مطابق قرآن میں موجود ہیں ۔ جن کی یہ رای ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ پیشینگوئی کا پورا ہونا من جانب اللہ ہونے کا صاف وصریح ثبوت ہے اور اس کی تائید میں وہ بیشک درستی سے استشنا ۱۸ : ۲۱ ، ۲۲ کو پیش کرتے ہیں لہذا ہم پر فرض ہے کہ نہایت درستی سے ان آیات قرآنی کو دیکھیں اور جانچیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں ان واقعات کے باب میں پیشینگوئیاں ہیں جو اس وقت ابھی وقوع میں نہیں آئے تھے جب حضرت محمد اپنے کاتبوں سے قرآن لکھوارہے تھے ۔ اگر اہلِ اسلام یوں کہنے پر راضی ہوں کہ قرآن کو حضرت محمد نے الہام سے خود تصنیف کیا اور جبرائیل نے ان کو نہیں لکھوایا تو ان کی دلیل زیادہ مضبوط ہو۔

جنہوں نے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن میں جتنی پیشینگوئیاں ممکن ہوں دریافت کریں وہ کہتے ہیں کہ کل شمار ۲۲ ہے۔ یہ ۲۲ پیشینگوئیاں آیات ذیل میں بیان کی جاتی ہیں جن میں سے بعض میں ایک سے زیادہ ہیں۔ سورہ بقرہ آیت ۲۱، ۲۲، ۸۸، ۸۹ سورہ آل عمران آیت ۱۰ ، ۱۰۷ ، ۱۰۸ ، ۱۴۴ ، سورہ مائدہ آیت ۱۷۔ سورہ انفال آیت ۷۔ سورہ توبہ آیت ۱۴ ۔ سورہ حجر آیت ۹ ، ۹۵ ، سورہ نور آیت ۵۴ ، سورہ قصص آیت ۸۵ ۔ سورہ روم آیت ۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ ، سورہ سجدہ آیت ۲۴ ، سورہ فتح آیت ۱۶ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۷ ، ۲۸۔ سورہ قمر آیت ۴۴ ، ۴۵ ، سورہ صف آیت ۱۳ ، سورہ نصر آیت ۱ ، ۲۔

صاحب فکر وہوش مطالعہ کنندہ معلوم کریگا کہ یہ پیش کردہ پیشینگوئیاں تین حصوں میں مُنقسم ہوسکتی ہیں یعنی (۱)۔ وہ جو حضرت محمد کی فتوحات کے بارے میں۔(۲) وہ جو خود قرآن ہی کے حق میں ہیں۔(۳) روم کے بارہ میں ایک ہی پیشینگوئی۔ اب ہم ان کا بالترتیب حتی الوسع مختصراً ذکر کرینگے۔

اول قسم کی آیات پر زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فی الحقیقت یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ جن واقعات سے مفسرین ان آیات کو منسوب کرتے ہیں ان کے وقوع میں آنے سے پیشتر لکھی گئیں یا نازل ہوئیں۔ لیکن ممکن ہے کہ احادیث ان آیات کو ان واقعات سے پیشتر کی بتانے میں ٹھیک ہوں اور ہم دلیل کی خاطر مان لیتے ہیں لیکن یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ حضرت محمد نے لڑائی سے پیشتر فتح کا وعدہ کیا۔ قریباً سب سپہ سالار اپنے سپاہیوں کی ہمت افزائی کے لئے ایسا ہی کرتے ہیں ۔ آخر کار ایک فریق فتح پاتاہے یا کم ازکم فتح یاب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ دونوں طرف کے سپہ سالار پہلے فتح کی پیشینگوئی کرچکتے ہیں اور دونوں میں سے ایک کی پیشینگوئی پوری ہوجاتی ہے ۔ اور وہ اپنی پیشینگوئی میں سچا ٹھہرتا ہے تو بھی ہم اس کو نبی یا خاتم النبین نہیں سمجھتے۔ بیشک چنگیز خان اور تیمور لنگ نے اپنے سپاہیوں کو جنگ میں فتح یابی اور اپنے دشمنوں کا مال واسباب لوٹنے کا وعدہ دیا تھا۔ وہ وعدہ پورا ہوگیا اور دشمنوں نے شکست کھائی لیکن اس بناء پر کون ان فتح مندوں کو خدا کے نبی یا رسول مانتا ہے؟ چونکہ حضرت محمد کے مومنین آنحضرت کے من جانب اللہ اور رسول اللہ ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے آپ کے

وعدہِ فتح وغنیمت کو بھی خدا کی طرف سے مان لیا لہذا ان کو قائل کرنا قریباً نا ممکن تھا جیسا کہ بعد میں وہابیوں کا حال تھا اور ماضی قریب میں سوڈانی محمدی اوراس کے خلیفہ کے تابعین کا تھا۔

اس حقیقت کوزیادہ صاف طور سے سمجھنے کی غرض سے ہم جنگِ بدر کے بیان پر غور کرینگے جس کے بارے میں بعض کا یہ دعویٰ ہے کہ سورہ قمر کی ۴۴ویں اور ۴۵ویں آیت میں پیشینگوئی مندرج ہے۔ اس لڑائی کے متعلق بیضاوی سورہ نفال کی پانچویں آیت کی تفسیر میں بیان کرتا ہے کہ ابوسفیان ۳۹ سواروں کے ساتھ سیریا سے ایک کارواں لارہا تھا۔ حضرت جبرائیل نے حضرت محمد کو خبر دی کہ کارواں کے محافظ بہت تھوڑے ہیں اور اس میں مال ومتاع بہت زیادہ ہے۔ لہذا حضرت محمد نے ترغیب دی کہ اس کارواں پر حملہ کرکے اس کو لوٹ لیں۔ اسی اثنا میں ابوجہل اہلِ مکہ کی فوج لے کر بدر کی طرف روانہ ہوا۔ یہ خبر سن کر مسلمانوں نے حضرت محمد سے پوچھا کہ آپ نے ہم کو یہ کیوں نہ بتایا کہ ہمیں لڑنا ہوگا تاکہ ہم لڑائی کی تیاری کرتے؟ انہوں نے چاہا کہ دشمن کو چھوڑ کر اس غیر محفوظ کارواں کا پیچھا[1] کریں جس کی حضرت محمد نے ان کو ساحلِ بحر کے پاس سے گذرنے کی خبر دی تھی۔ اس سے حضرت محمد خفا ہوگئے اور آنحضرت نے ان کو یقین دلایا کہ خدا نے ہر دوفریق میں سے ایک کو ہمارے ہاتھ میں دے دینے کا وعدہ کیا ہے یعنی یا توکارواں یا دشمنوں کا لشکر۔ چھٹی آیت کی تفسیر میں بیضاوی بتاتا ہے کہ مسلمان جنگ کے لئے کیسے

[1] بیضاوی کا بیان ہے فقالو یارسول اللہ علیکہ بالعیر ودع العدو یعنی یارسول اللہ کارواں کولے اور دشمن کو جانے دے۔

نارضامند تھے کیونکہ وہ شمار میں[2] دشمنوں سے بہت کم تھے۔ ان میں فقط دو سوار تھے جس سے ظاہر ہے کہ وہ لڑائی کے لئے تیار نہیں تھے۔ سورہ قمر کی ۴۴ویں اور ۴۵ویں آیت کی تفسیر میں وہ کہتا ہے کہ عمر نے بعد میں کہا کہ جب تک میں نے حضرت محمد کو اس روز جنگ میں زرہ بکتر پہنتے نہ دیکھا ان آیات کے معنی نہیں سمجھتا تھا۔ سورہ انفال کی چھٹی آیت سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس روز پہلے پہلے مسلمان قریش پر حملہ کرنے سے ڈرتے تھے کیونکہ یوں مرقوم ہے يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ یعنی تجھ سے جھگڑتے تھے درست بات میں واضح ہوچکنے کے بعد۔ گویا ان کو ہانکتے ہیں موت کی طرف آنکھوں دیکھتے۔ ابن ہشام اس واقعہ کا بیان یوں لکھتاہے " جب رسول اللہ نے سنا کہ ابوجہل سیریا سے آرہا ہے تو مسلمانوں کو ابھارا کہ اس پر حملہ کریں اور کہا یہ قریش کا کارواں ہے جس میں ان کا مال ہے۔ لہذا تم اس پر حملہ کرو۔ شاید خدا اسے تمہارے حوالہ کردے۔ اس لئے لوگوں کو اس پر تحریص ملی۔ ان میں سے بعض مستعد تھے اور بعض بے پروا تھے کیونکہ ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ رسول اللہ جنگ کرینگے۔ پھر جب ابوسفیان حجاز کے نزدیک پہنچا تو ہر ایک سوار سے جواسے ملاحال دریافت کرتا رہا کیونکہ وہ آنحضرت کے مومنین سے ڈرتا تھا۔ یہاں تک کہ آخر کار کسی مسافر سے اس کو یہ خبر مل گئی کہ حضرت محمد نے اپنے اصحاب کو اس کے اوراس کے کارواں کے خلاف جمع کیاہے۔ پس وہ خبر پا کر ہوشیار ہوگیا اور اس نے ضمضم ابن عمر والغفاری کو مزدوری مقرر کرکے اہل مکہ کے پاس بھیجا اوراسے کہا

[2] ابن اسحاق کہتا ہے کہ حضرت محمد کے ساتھ اہل مکہ میں سے ۸۳ بنی اوس میں سے ۶۱ بنی خزرج میں سے ۱۷۰ آدمی تھے یعنی کل ۳۱۴ آدمی اورابوجہل کے ساتھ قریباً ۶۰۰ آدمی تھے۔

کہ سیدھا قریش کے پاس جاکر ان سے کہدے کہ اپنے کارواں کی حمایت وحفاظت کے لئے جمع ہوں اوران کو یہ بتادے کہ محمد نے ہم پر (ابو سفیان اوراس کے ساتھیوں پر (حملہ کرنے کو کوچ کیا"۔ یہ خبر سن کر قریش کی ایک بڑی جماعت اپنے مال کی حفاظت کے لئے روانہ ہوئی۔ حیات[1] القلوب میں بھی انہی دونوں بیانوں کے مطابق لکھا ہے کہ حضرت محمد نے اپنے اصحاب کو خبردی کہ کارواں تو گذر گیا ہے اور قریش کی فوج ہماری طرف بڑھی چلی آرہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھ کوان سے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ سن کر آنحضرت کے اصحاب بہت ہی خوف زدہ اور فکر مند ہوگئے۔ ایک دوسرے مقام پر اس بیان کا لکھنےوالا کہتا ہے کہ (جب حضرت محمد کے اصحاب نے قریش کی بڑی تعداد کی خبر سنی تو بہت ڈر گئے اور بلند آواز سے چلائے اور روئے ) پس اسی سبب سےان کی ہمت بڑھانے اوراس ضروری جنگ میں ان کو مردانگی کے ساتھ لڑنے کے قابل بنانے کے لئے آنحضرت نے سورہ قمر کی ۴۴ویں اور ۴۵ویں آیت سنائی۔اس میں آنحضرت کی دانائی پائی جاتی ہے کیونکہ ایسے موقع پر سپہ سالا اکثر ایسا ہی کرتے ہیں لیکن آپ کی زیادتی اس میں تھی کہ آپ نے ہمت افزائی اور وعدہ فتح کو من جانب اللہ بتایا۔ ایسے الفاظ سے خوش ہوکر مسلمان بہادری سے لڑے اورایک نمایاں فتح حال کی لیکن یہ کسی صورت میں معجزہ نہ تھا اورجو ہمت افزائی کے الفاظ حضرت محمد نے فرمائے ان کو بھی پیشینگوئی کہنا ہرگز ہرگز درست نہیں ہے۔

اب ہم دوسری قسم کی آیت کو دیکھینگے ۔ان میں سے بعض قرآن کے کامل صورت میں ہر طرح کے نقصان سے محفوظ رہنے کے بارے میں پیشینگوئیاں خیال کی جاتی ہیں۔ اظہار الحق کامصنف اس مضمون پر لکھتے وقت سورۃ الحجر کی نویں آیت إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ یعنی ہم نے اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ ہی اس کے نگہبان ہیں اقتباس کرکے کہتا ہے یعنی جو کچھ نازل ہوا اس میں قاریاں وقت کی طرف سے کمی وبیشی اور تغیر وتبدل سے۔ چنانچہ جیساکہا تھا بالکل ویسا ہی ہوا ہے۔ کفار وقرامطہ میں سے بھی آج تک کسی سے یہ نہیں ہوسکا کہ اس کے اصلی حروف میں سے ایک حرف یامعنی یا کسی حرکت کو بھی بدل ڈالے "۔ جن پڑھنے والوں نے ہماری اس کتاب کے دوسرے حصے کے تیسرے باب کو پڑھا ہے اور جن کو یاد ہے کہ حضرت عثمان نے قرآن کے تمام پرانے نسخوں کو کس طرح سے نیست ونابود کیا تھاوہ اظہار الحق کے مصنف کے اس بیان کی بے حقیقی کو خوب سمجھ لینگے۔ اگر یہ بیان درست ہے تو بہت سی احادیث صحیحہ غلط ہیں کیونکہ ان میں مرقوم ہے کہ بعض آیات قرآن مثلاً آیت الرجمہ گم ہوگئی ہیں۔ لہذا سورۃ الحجر کی نویں آیت پیشینگوئی قراردی جائے تو اس کا پورا ہونا بالکل ثابت نہیں ہوتا۔ پس یہ دوسری قسم کی پیشینگوئیاں بھی قسم اول کے مانند بے حقیقت ہیں۔ ان سے قرآن کا الہامی ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ حضرت محمد کی نبوت ورسالت کا ثبوت ملتا ہے۔

تیسری قسم کی آیات میں فقط سورۃ الروم کی پہلی چار آیتیں ہیں جو قرآن کے عام معمولی نسخوں میں یوں مندرج ہیں غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ لِلَّهِ الْأَمْرُ

[1] سیرۃ الرسول جلد دوم صفحہ ۹۔ جلد دوم ۳۰واں باب۔

مِن قَبْلُ وَمِن بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللَّهِ يَنصُرُ مَن يَشَاء وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ یعنی دب گئے ہیں رومی نزدیک کے ملک اور وہ اس دبنے کے بعد اب غالب ہونگے کئی برس میں۔ اللہ کے ہاتھ میں ہے کام پہلے اور پیچھے اوراس دن خوش ہونگے مسلمان اللہ کی مدد سے ۔ مدد کردے جس کی چاہے اور وہی ہے زبردست رحم والا۔ بعض مسلمان کہتے ہیں کہ یہ ایسی بڑی اور صریح پیشینگوئی ہے کہ حضرت محمد کے نبی ہونے میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔وہ کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں اہل روم کے سیریا میں خسرو پرویز کی فارسی فوج سے شکست کھانے کا ذکر ہے۔ جب اہلِ فارس کی اس فتح کی خبر مکہ میں پہنچی تو مشرک لوگ خوش ہوئے اورکہنے لگے کہ مسلمان اور مسیحی اہل کتاب میں اور ہم اوراہل فارس غیر قوم ہیں جن کے پاس کوئی کتاب نہیں۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور یہ پیشینگوئی کی کہ اہل روم بہت جلد اہلِ فارس کو مغلوب کرینگے۔ حضرت ابوبکر نے ابے ابن خلف سے شرط لگائی کہ یہ پیشینگوئی تین سال کے اندر اندر پوری ہوجائیگی لیکن جب اسے حضرت محمد سے معلوم ہوا کہ لفظ بضع جو تیسری آیت میں استعمال ہوا ہے اس کے معنی تین سال سے لے کر نوسال تک کے عرصہ کے ہیں تو اس نے شرط کے الفاظ کو بدل لیا۔ پھر کہا جاتا ہے کہ اہلِ روم اپنی شکست کے بعد سات سال کے اندر اندر اپنے دشمن پر غالب آئے اور حضرت ابوبکر نے اُبے مرحوم کے وارثوں سے شرط کا روپیہ وصول کیا۔ یہ توکہانی ہے۔ اب ہم دیکھینگے کہ اس میں سچائی کہاں تک ہے اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ یہ آیات رومیوں کی فتوحات سے پہلے کی تصنیف ہیں اوران کی موجودہ قرات مندرجہ قرآن صحیح ہے۔

تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ فارس نے اہل روم کو سنہ ہجری سے چھ سال پہلے سیریا میں شکست دی یعنی ۶۱۵ء میں۔ چونکہ یہ شکست مکہ سے نزدیک ترین ملک میں وقوع میں آئی اس لئے اسکی خبر چند ہی روز میں پہنچ گئی ہوگی۔ بیضاوی کہتا[1] ہے کہ جب اہلِ روم نے اہل فارس کو روزِ حدیبیہ میں شکست دی تو یہ پیشینگوئی پوری ہوگئی ۔ لیکن عہد نامہ حدیبیہ ماہ ذی العقدہ ۶ ہجری یعنی مارچ ۶۲۸ء میں وقوع میں آیا۔ لہذا اگر یہ مفسر سچ کہتا ہے تو دونوں واقعات کے درمیان سات سال نہیں بلکہ بارہ سال گذرگئے۔ پس اگر حضرت محمد نے لفظ بضع کا مفہوم تین سال سے نوسال تک کا عرصہ بتایا تھا تو مندرجہ بالاواقعات سے آنحضرت کے دعویٰ کی تائید نہیں ہوتی۔

اہلِ روم کے انجام کار فتحیاب ہونے کے باب میں پیشینگوئی کرنا کسی ہوشیار آدمی کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ پہلے پہلے اہلِ فارس کا فتحیاب ہونا قریش کی نظر میں تعجب خیز تھا اوراسی واسطے وہ خبر پاکر بہت خوش ہوئے ۔ حضرت ابوبکر نے غالباً حضرت محمد سے مشورہ کئے بغیر ہی شرط لگالی تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو حضرت ابوبکر[2] کو بھی حضرت محمد کی طرح اس امر کا پختہ یقین تھا کہ آخر کار اہلِ روم اپنے دشمنوں پر فتحیاب ہونگے۔ اس یقین کا سبب یہ تھا کہ ان ایام میں سلطنت فارس کی بے ثباتی اظہر من الشمس تھی۔ نوشیروان کی موت (۵۷۸ء) سے یزوجردسوم کی ہزیمت تک جو ۶۴۲ء میں ھاوند کی لڑائی میں ہوئی تختِ فارس پر کم از کم چودہ بادشاہ بیٹھ چکے تھے جن میں سے بہت سے تھوڑی تھوڑی دیر تک حکومت کرنے کے بعد قتل کئے گئے۔ خسروپرویز کی موت (۶۲۷ء)

---

[1] دیکھو بیضاوی کا حاشیہ

[2] اگرچہ حضرت ابوبکر نبی نہیں تھے۔

سے یزدجرد سوم کی تخت نشینی (۶۳۲ء) تک پانچ سال کے عرصہ میں گیارہ فارسی بادشاہوں نے سلطنت کی۔ جس ملک میں اس قدر اندرونی بد نظمی موجود تھی اس کے لئے رومی سپاہ کا دیر تک مقابلہ کرنا بالکل ناممکن تھا اور حضرت اس کو تاڑ گئے تھے۔ ہم رومی فتوحات کا آغاز ۶۲۵ ء سے سمجھ سکتے ہیں۔ کچھ ضرورت نہیں کہ بیضاوی کی طرح دو سال بعد سے سمجھیں۔ پھر اہلِ روم نے شکست کھانے کے دس سال بعد فتح حاصل کی اور تین اور نو سال کے درمیانی عرصہ میں ان کو فتح نصیب نہیں ہوئی۔

ابن ہشام سیرۃ الرسول میں ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے جس سے عیاں ہے کہ حضرت محمد نے فی الحقیقت اہلِ فارس کی کمزوری کو محسوس کرلیا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ہجرت سے پیشتر جب حضرت محمد اور سرداران قریش مکہ میں ابوطالب کے پاس جمع تھے تو حضرت محمد نے ان کو ترغیب دی کہ کلمہ کے پہلے حصہ کو پڑھیں اور شرک سے دست بردار ہوں اور آنحضرت نے یہ وعدہ کیا کہ اگروہ ایسا کریں تو تمام عرب و عجم زیر ہوجائیگا۔ چنانچہ آنحضرت نے کہا "یا عم کلمۃ واحدۃ یعطو نیھا تملکون بھا العرب وتدین لکمہ بھا العجم یعنی اے چچا میں فقط ایک کلمہ چاہتا ہوں۔ اس کے وسیلہ سے تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور اسی کے ذریعہ سے فارس تمہاری اطاعت کریگا[1]۔

لیکن سورۃ الروم کی منقولہ بالا آیات کا اختلافِ قرات پیش کرکے بیضاوی نے اسلامی استدلال کی بالکل بیخکنی کردی ہے۔ وہ کہتا ہے بعض لوگ غُلبَت کی غَلبَت اور سَیغُلون کی جگہ سیَغلبون پڑھتے ہیں۔ اس حالت میں یہ مطلب ہوگا کہ اہلِ روم ملک کے نزدیک ترین حصہ میں فتحیاب ہوئے ہیں اور وہ چند سال کے عرصہ میں شکست کھائینگے"۔ وغیرہ۔ اگر یہ قرات صحیح ہے تو حضرت ابوبکر کے اُبے کے ساتھ شرط لگانے کی کہانی بالکل بے بنیاد افسانہ ہے کیونکہ اُبے مسلمانوں کے رومیوں پر فتحیاب ہونے بلکہ ہرقل کے اہلِ فارس کو شکست دینے سے بہت عرصہ پیشتر وفات پاچکا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایسی احادیث کیسی ناقابل اعتماد ہیں۔ بیضاوی اس کا مطلب یوں بیان کرتا ہے کہ اہلِ روم نے ریف الشام یعنی سیریا کی سیراب زمین پر فتح پائی اور ان آیات میں یہ پیشینگوئی تھی کہ مسلمان ان پر بہت جلد غالب آئینگے۔ اگر مطلب یہی ہے تو جس حدیث میں ان آیات کا ہجرت سے چھ سال پیشتر نازل ہونا بیان کیا گیا ہے وہ حدیث ضرور غلط ہے اور یہ آیات ۶ ہجری سے پیشتر کی نہیں ہوسکتیں۔ چونکہ جب قرآن پہلے پہل کوئی حروف میں لکھا گیا اس وقت اعراب وحرکات وغیرہ کا استعمال نہیں تھا۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ ہر دو قرات مندرجہ بالا میں سے یقینی طور پر صحیح قرات کو دریافت کرنا ناممکن ہے۔ اب ہم دیکھ چکے ہیں کہ (۱) ان آیات کے وقت نزول (۲) ان کی صحیح قرات اور (۳) معانی کے باب میں کیسا اختلاف ہے اور یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ ان میں پیشینگوئی مندرج ہے جو پوری ہوگئی تھی۔ لہذا یہ حضرت محمد کی نبوت ورسالت کا کوئی ثبوت نہیں ہوسکتا۔

لہذا استدلال کی وہ تمام عمارت جو کہ قرآن کی مفروضہ پیشینگوئیوں پر مبنی ہے تحقیق کرنے سے بالکل منہدم ہوجاتی ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے ہمیں قرآن کے ان ۲۲ مقامات کا مسیح کے حق میں عہدِ عتیق کی پیشینگوئیوں کے سلسلہ سے مقابلہ کرنا چاہیے یا ان سے جو عہدِ عتیق

[1] سیرۃ الرسول جلد اول صفحہ ۱۴۶

وجدید دونوں میں اسرائیل کے حق میں مندرج ہیں یا ان سے جو کتاب مکاشفات میں مرقوم ہیں اور پوری ہوچکی ہیں مثلاً مکاشفہ کا نواں باب اور چودھویں باب کی چھٹی آیت۔

قرآن کے الہامی اور وحیِ آسمانی ہونے کا ایک اور ثبوت یہ پیش کیا جاتا ہے کہ قرآن پرُانے وقتوں اور نیست ونابود شدہ اقوام کی اخبار بیان کرتا ہے۔ ایسی اخبار اگر معتبر ہوں تو مفید ہیں لیکن اس سے پیشتر کہ ہم ان اخبار کو صحیح تسلیم کریں ان کو پرکھنا اور جانچنا ضروری ہے جیسا کہ تاجر روپیہ کو قبول کرنے سے پیشتر خوب دیکھ لیتا ہے۔خالص سونے کو کسی طرح کے کسی محکِ امتحان کا کچھ خوف نہیں۔ وہ ہر محک ومعیار بلکہ جلتی ہوئی آگ سے بھی بے نقصان اور خالص ہونے کی تصدیق حاصل کرکے نکلتا ہے۔ اب ہم دیکھینگے کہ تواریخی بیانات مندرجہ قرآن ایسے ہی ہیں یا نہیں۔تاہے (سورة الاعلیٰ ۱۹ ویں آیت)۔ویں صفحہ پر عادو ثمود کے بارے میں الکندی کا بیان ملاحظہ کیجئے۔ کتابوں سے لیا جن کو قرآن صحفِ ابراہیم قدیم عربی اقوام عاد و ثمود کے وجود کا علم ہم کو دو قدیم یونانی مصنفوں یعنی بطلیموس اور ڈایوڈورس سکولس کی تصانیف سے حاصل ہوتاہے ۔ اس پر قرآن کوئی ایسا اضافہ نہیں کرتا جس کو تواریخی کہہ سکیں۔ زمانہ حال کی بہت سے بڑی بڑی دریافتوں سے بائبل کے ان بیانات کی کامل طور سے تائید وتصدیق ہوتی ہے جو مصر اور بابل اور سیریا کی قدیم اقوام کے بارے میں مندرج ہیں۔ لیکن کسی ایسی دریافت سے قرآن کے عادی وثمودی بیان کی تائید نہیں ہوئی۔ لہذا اہلِ [1]علم کی یہ رائے ہے کہ حضرت محمد نے جو کچھ ان اقوام کے بارے میں بیان کیا وہ آنحضرت نے صابیوں کی کتابوں سے لیا جن کو قرآن صحفِ ابراہیم کہتاہے (سورة الاعلیٰ ۱۹ ویں آیت)۔

[1] رسالتہ عبد اللہ مطبوعہ لندن ۱۸۸۰ء کے ۷۵ویں صفحہ پر عادو ثمود کے بارے میں الکندی کا بیان ملاحظہ کیجئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں حضرت محمد نے دریافت کرلیا کہ یہ صحیفے جعلی ہیں اور اسی واسطے دعوایٰ نبوت کے قریباً چار سال بعد ان کا ذکر کرنا بالکل بند کردیا۔ ممکن ہے کہ ھود وصالح اور شعیب مسیحی مناد ہوں جن کو ان عربی اقوام نے رد کیا جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔چونکہ ان کے حق میں اور کہیں کوئی بیان نہیں ملتا لہذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ اگر وہ کبھی رویِ زمین پر تھے بھی تو کب تھے۔ قرآن ان کا کافی بیان نہیں کرتا۔ علماکہتے ہیں کہ چونکہ قرآن کے بیانات ان اشخاص کے بارے میں جو حضرت محمد سے بہت عرصہ پیشتر تھے اور جن کے وجود کی خبر ہم کو تواریخ سے ملتی ہے ہمیشہ درست نہیں ہیں اس لئے ہم ایسے بیانات کو تواریخاً صحیح تسلیم کرنے پیشتر شہادت کا انتظار کرینگے۔ مثلاً جو کچھ قرآن حضرت ابراہیم کے بارے میں بیان کرتا ہے اس کا بہت سا حصہ توریت کی تعلیم سے مطابقت نہیں رکھتا درحالیکہ قرآن توریت کی تصدیق کے لئے نازل ہونے کا مدعی ہے۔ اس کے آگ میں ڈالے جانے اور سلامت نکل آنے کی کہانی ایک یہودی افسانہ سے اخذ کی گئی ہے۔ یہ افسانہ ایک لفظ کا غلط ترجمہ کرنے کے سبب سے پیدا ہوگیا تھا۔ ینابیع الاسلام کے مصنف نے اس بات کو ثابت کردیا ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام آزر نہیں تھا(سورة الانعام ۷۴ویں آیت)۔ اس کا نام تارح تھا(پیدائش ۱۱: ۲۶)۔ پھر سورة الاعراف کے سولھویں رکوع کی چوتھی آیت میں مرقوم ہے کہ حضرت موسیٰ کے وقت میں خدا نے اہلِ مصر پر طوفان بھیجا۔ اس میں ال کے ساتھ "الطوفان" لکھا ہے۔ اس سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ آیا

یہ طوفان نوح ہی تو نہیں جس کا ذکر اسی سورۃ کے آٹھویں رکوع کی آخری آیت میں ہے ؟ سورہ آل عمران کی ۳۰ویں آیت سے ۴۴ویں آیت تک صاف طور سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ مریمہ عمران کی بیٹی (سورہ تحریم آخری آیت )اور ہارون کی بہن (سورہ مریم کی ۲۹ویں آیت ۔ نیز دیکھو خروج ۱۵ : ۲۰ ، گنتی ۲۶ : ۵۹) ہی حضرت مریم سیدنا مسیح کی ماں تھی جو قریباً ۱۴۰۰ سال بعد میں ہوئی۔ کتاب الاآداب میں مسلم نے لکھا ہے کہ نجران کے مسیحیوں نے یہ تواریخی غلطی مغیرہ کو بتائی اوراس نے اس مضمون پر حضرت محمد سے گفتگو کی لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ قریباً ۱۳۰۰ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گذرچکا ہے اوراب تک علمائِ اسلام کو اس کا کوئی خاطر خواہ تسلی بخش جواب نہیں سوجھا۔

پھر سورۃ الکہف کے گیارہویں رکوع میں ذوالقرنین کا قصہ مندرج ہے۔ ابن ہشام[1] اور بیضاوی دونوں اس کو مقدونیہ کا سکندر اعظم بتاتے ہیں ۔ بیضاوی[2] یوں لکھتا ہے " ذوالقرنین یعنی یونانی سکندر شاہِ فارس ویونان۔ اور شاہ مشرق ومغرب بھی کہتے ہیں اور اسی واسطے وہ ذوالقرنین کہلاتا تھا یا اس لئے کہ دنیا کے دوسینگ یعنی مشرق ومغرب اسی پر قائم تھے اوراس لئے بھی کہ اس کے زمانہ میں بنی آدم کی دوپشتوں کا خاتمہ ہوگیا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے دوسینگ بنے تھے اور گمان غالب ہے کہ اس کو یہ لقب اس کی شجاعت کے سبب سے دیا گیا تھا جیسا کہ شجاع سر گردہ کو بینڈھا کہتے ہیں۔ گویا وہ اپنے

[1] سیرۃ الرسول جلد اول صفحہ ۵

[2] تفسیر سورۃ الکہف جلد اول صفحہ ۵۷۳

دشمنوں کو ٹکریں مارتا تھا۔ اس کے نبی ہونے کے باب میں اختلافِ رائے ہے۔اس کی ایمانداری وفاداری متفق علیہ ہے" ۔

اگر سکندر دوپشتوں تک زندہ رہا توان ایام میں انسانی زندگی بہت ہی کوتاہ ہوگی کیونکہ وہ فقط ۳۳سال کا تھا جب ۲۲۳سال قبل از مسیح باب میں میخوری کی عشرت میں مر گیا۔ نبی[3] یا واحد اور سچے خدا کا ایمان دارہونے کی جگہ وہ بُت پرست اوراس نے فی الحقیقت ایک مصری معبود امون کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ یقیناً اس نے آفتاب کو دلدل میں غروب ہوتے نہیں دیکھا تھا فی عین حمئۃ ۔ سورہ الکہف گیارہواں رکوع کی تیسری آیت ) یا ابن امروحمزہ اور الکسائی وابوبکر[4] کی قرات کے مطابق فی عین حامیۃٍ یعنی گرم چشمہ میں کیونکہ ہم جانتےہیں کہ آفتاب جیسا کہ اس آیت کے مصنف نے خیال کیازمین کے گرد گردش نہیں کرتا اور نہ کسی اس قسم کی جگہ میں غروب ہوتا ہے اور علاوہ بریں ہم حقیقی وسچی تواریخ جانتےہیں کہ سکندر نے دوپہاڑوں کے درمیان کوئی لوہے اور پیتل کی دیوار نہیں تعمیر کی (سورہ الکہف گیارہواں رکوع ) یا ایہنمہ بیضاوی اور دیگر مسلمان مصنفین یہ کہنے میں بے شک راستی پرہیں کہ وہ شخص سکندر ہی ہے جس کوقرآن ذوالقرنین کہتا ہے بینڈھے سے تشبیہ دینے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لقب کس طرح سے پیدا ہوگیا۔ دانی ایل ۸: ۳، ۴ میں ایک بینڈھے کا ذکر ہے جس کے دو سینگ تھے جو مغرب اور جنوب اور شمال کی طرف بڑھتا چلا گیا اور جس کو کوئی روک نہ سکا ۔صاف ظاہر ہے کہ سورۃ الکہف کے لکھنے والے نے اس بینڈھے کا ذکر سنا ہوگا اور خیال کیا ہوگا کہ اس سے سکندر مراد ہے جس کا

[3] سورۃ الکہف گیارہواں رکوع

[4] بیضاوی نے اقتباس کیا ہے۔

اسی باب میں ذکر ہے۔ لیکن اس میں اس نے غلطی کھائی کیونکہ دانی ایل ۸: ۲۰ میں مرقوم ہے اس دوسینگ والے مینڈھے سے مادی اور فارسی سلطنتیں بحثیتِ مجموعی مُراد تھیں اوراسی باب میں شاہِ مقدونیہ بکرے کے ماتھے پر کا سینگ بتایا گیاہے جس نے مینڈھے کو مغلوب کیا۔ یعنی تمام سلطنت فارس کو فتح کرلیا (دانی ایل ۸: ۵، ۷، ۲۱)عربی لفظ کبش (مینڈھا) کے استعمال نے جس کے معنی شجاع سردار کے بھی ہیں (جیسا کہ بیضاوی لکھتاہے)۔ اس شخص کو مغالطہ میں ڈال دیا جس نے قرآن میں سکندرِ اعظم کو ذوالقرنین کے لقب سے ملقب کیا۔ قرآن جو کچھ سکندرِ اعظم کے بارے میں بیان کرتا ہے ہم اس کی راستی وصداقت کو پرکھ سکتے ہیں کیونکہ سکندرِ اعظم تواریخ کی پوری روشنی کے زمانہ میں تھا۔ سب جانتے ہیں کہ مشہور فیلسوف ارسطا طالیس اس کا اتالیق واستاد تھا۔ ارین قونٹس گریٹیس اور دیگر مشہور مورخین نے سکندرِ اعظم کے کارنامے مفصل لکھے ہیں اوران کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔ لہذا جب اصحاب علم دیکھتے ہیں کہ قرآن اس بادشاہ کے بارے میں کیسی غلط بیانیاں کرتاہے جس کی تواریخ سے لوگ خوب واقف ہیں توان کو خواہ مخواہ قرآن کے دیگر تواریخی بیانات کو حق تسلیم کرنے میں تامل ہوتاہے۔

قرآن بیان کرتاہے کہ فرعون کی بیوی نے حضرت موسیٰ کو متبنیٰ بنایا (سورۃ القصص آٹھویں آیت )درحالیکہ حضرت موسیٰ نے خود توریت میں فرمایاہے کہ ان کو فرعون کی بیٹی نے متبنیٰ بنایا تھا (خروج ۲: ۵تا ۱۰)۔قرآن میں کسی جگہ پر مرقوم ہے کہ ھامان فرعون کا بڑا مقرب اور کارگذار[1] تھا لیکن آستر[2] کی

[1] سورۃ القصص آیت ۵، ۷، ۳۸۔ سورۃ العنکبوت آیت ۳۸۔ سورۃ المومن آیت ۲۵، ۳۸

[2] آستر ۳: ۱-۷: ۱۰۔

کتاب سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ھامان اخسویرس بادشاہ کا منظورِ نظر تھا اور فرعون کے ایام میں مصر میں نہیں تھا بلکہ صدہا سال بعد میں ملکِ فارس میں تھا۔ پھر قرآن کہتاہے کہ فرعون نے ھامان کو حکم دیا کہ اینٹوں سے ایک مینار تعمیر کرے جس کی چوٹی آسمان سے ٹکرائے (سورۃ القصص ۳۸ویں آیت ۔ سورۃ المومن ۳۸ویں ، ۹ ۳ویں آیت )۔لیکن پیدائش کے گیارھویں باب کی پہلی ۹ آیات میں مرقوم ہے کہ فرعون سے صدہا سال پیشتر بابل میں لوگوں نے یہ مشہور مینار تعمیر کیا تھا۔

سورہ طہ کی ۸۷ویں اور ۹۶ ویں آیت میں یہ بیان ہے کہ جس طلائی بچھڑے کی بنی اسرائیل نے بیابان میں پرستش کی اسے سامری نے بنایا تھا لیکن شہر سامریہ حضرت موسیٰ کی وفات کے صدہا سال بعد تعمیر ہوا (۱ سلاطین ۱۶: ۲۴) بیشک اس سورۃ کا مصنف تخلیط واشتباہ میں پڑگیا اورجو طلائی بچھڑا بنی اسرائیل نے بیابان میں بنایا اس میں اورجن دو طلائی بچھڑوں کی اسرائیلی نے بیابان میں بنایا اس میں اورجن دو طلائی بچھڑوں کی اسرائیلی سلطنت میں حضرت داؤد وسلیمان کے بعد پرستش کی گئی (۱ سلاطین ۱۲: ۲۸)۔ ان میں امتیاز نہ کرسکا لیکن یہ بعد کے دو بچھڑے بھی کسی سامری نے نہیں بنائے تھے کیونکہ سامریہ ہنوز تعمیر نہ ہوا تھا مگر جب تعمیر ہوا تو اس سلطنت کا دارالسلطنت بن گیا اور مذکورہ بالا نہایت موٹی تواریخی غلطی کا سبب یہی تھا۔

پھر سورۃ البقر کے ۲۳۳ویں رکوع کی پہلی آیت میں ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ جنگی مردوں کے انتخاب کے لئے دیکھا گیاکہ وہ پانی کس طرح پیتے ہیں۔ قرآن بیان کرتاہے کہ یہ واقعہ طالوت (ساؤل )کے عہد کا ہے جبکہ حضرت داؤد

نے جالوت کو قتل کیا لیکن بائبل سے صاف عیاں ہے کہ یہ واقعہ بہت عرصہ پیشتر جدعون کے وقت کا ہے۔

سورۃ الکہف کی ۸ویں آیت سے ۲۶ویں آیت تک اصحاب کہف کا قصہ مندرج ہے لیکن ینابیع الاسلام کے مصنف نے ثابت کردیا ہے کہ یہ افسانہ کس طرح وجود میں آیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ جاہلیت میں بعض بے علم مسیحی اس کو مانتے تھے اوران سے اہلِ مکہ اور اس سورۃ کے مصنف نے اس کہانی کو سیکھ لیا کیونکہ یہ کہانی اوربہت سے راہبانہ افسانوں کے ساتھ بہت سے سریانی مصنفین کی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ یورپ میں یہ بچوں کو بہلانے کی ایک کہانی ہے اور اس کی کئی صورتیں ہیں لیکن اس کی اصل ایک بیدین یونانی مصنف ڈایوجینیس لایر یسیس کا افسانہ ہے جو اس نے ایپی مینڈیس کی خواب دراز کے بارے میں بیان کیا ہے۔ ایپی مینڈیس ایک غیر قوم یونانی لڑکا تھا جو کئی سال تک ایک غار میں سویا (ڈایوجینیس اس لڑکے کے عمر کے بارے میں یونانی مصنفین کے متضاد بیانات نقل کرتا ہے۔

فی الحقیقت اس بات کی ضرورت نہیں کہ قرآن سے اورایسے بیانات کو نقل کریں جن کواہلِ علم تواریخی اغلاط اور خلاف بیانیاں کہتے ہیں۔ جو کچھ کہا گیاہے اس سے معزز پڑھنے والے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ قرآن کے وحیِ آسمانی ہونے اور حضرت محمد کی نبوت ورسالت کے ثبوت میں قرون خالیہ اوراقوام سالفہ کی قرآنی اخبار کو پیش کرنا بعید از عقل اورخلافِ دانش ہے۔

قرآن کے وحی آسمانی ہونے کا ایک اور ثبوت یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے بیانات باہمی تناقض سے بالکل پاک ومبرا ہیں۔ بعض مسلمان کہتے ہیں کہ اتنی بڑی کتاب اگر خدا کی طرف سے نہ ہوتی تو اس میں بہت سی متناقض ومتضاد باتیں ہوتیں لیکن اہلِ علم قرآن میں بہت سی متناقض ومتضاد باتیں ثابت کرچکے ہیں۔ ان میں سے بعض تو خفیف سی ہیں لیکن بعض بہت بڑی باتیں ہیں۔ خفیف تناقض کی مثال پیش کرنے میں ہم معزز پڑھنے والوں سے درخواست کرتے ہیں کہ سورۃ الواقعہ کی ۱۳ویں اور ۱۴ویں آیت کا ۳۸ویں اور ۳۹ویں آیت سے مقابلہ کریں۔ اس تناقض کو دور کرنے میں بیضاوی کی کوشش اور زمخشری کی روایت اس مقام پر تسلی بخش نہیں ہیں۔ لیکن یہ تو خفیف سامعاملہ ہے۔ اب ہم بعض بڑے بڑے تناقض قرآنی کو پیش کرینگے۔

سورۃ النسا کی ۵۱ویں اور ۱۱۶ویں آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جو گناہ خدا کبھی معاف نہیں کریگا وہ شرک ہے۔ لیکن سورہ انعام کی ۷۶ویں اور ۷۷ویں اور ۷۸ویں آیات میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ابراہیم خلیل اسی گناہ میں گرچکا ہے۔ تمام مسلمان ابراہیم کو نبی مانتے ہیں اور ان کے نزدیک تمام انبیاء کو معصومین یعنی بے گناہ نہ ماننا نہایت ہی بڑی بات ہے۔ اگرچہ خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا ناقابل معافی گناہ ہے توبھی قرآن میں مرقوم ہے کہ جب ابلیس نےآدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو مردوددرگاہِ الہیٰ ہوگیا(سورہ البقرہ ۳۴ویں آیت ، سورہ الاعراف ۱۱ویں آیت۔ سورہ بنی اسرائیل ۳۶ویں آیت، سورہ الکہف ۴۸ویں آیت۔ سورہ طہ ۱۱۵ویں آیت)۔

قرآن ریاکاری کی مذمت بیان کرنے میں بالکل راستی پر ہے (سورہ البقرہ ۷۸ویں آیت ۔ سورہ النسا ۱۲۷ویں آیت ۔ سورہ توبہ آیت ۶۵ سے ۶۹ تک۔ سورہ المجادلہ ۱۳ویں آیت ) قرآن کہتا ہے کہ دوزخ کا سب سے زیرین طبقہ ریاکاروں کے لئے مخصوص ہے(سورۃ النسا ۱۴۴ویں آیت )اب اس میں کسی کو کلام نہیں کہ جو لوگ مجبوراً اپنی دینی تبدیلی کو ظاہر کرتے ہیں

اور محض اپنے لبوں سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں جس کو دل سے نہیں مانتے وہ ریاکار ہیں۔ لیکن قرآن اہل اسلام کو حکم دیتا ہے کہ دیگر بنی آدم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں یعنی ان کو زبردستی ریاکار بنائیں کیونکہ قرآن میں بہت سے مقامات پر ایسی عبارات مندرج ہیں جو بعض حالات میں مسلمانوں کے لئے جہاد کو فرض ٹھہراتی ہیں۔ان کو تلوار میان میں کرنے کی اجازت نہیں جب تک کہ تمام غیر مسلمان اسلام کو قبول نہ کرلیں یا قتل نہ ہوجائیں بیشک اہل الکتب مستثنیٰ ہیں بشرطیکہ جزیہ دیں اور زیر کئے جائیں (سورہ توبہ آیت ۵، ۲۹، ۴۱، سورہ المائدہ آیت ۳۹، سورہ الصف آیت ۱۱۔ سورہ الحج آیت ۷۷)۔ریاکاری کی مذمت کرنا اور پھر بھی مسلمانوں کو حکم دینا کہ بنی آدم کو ریاکار بننے پر مجبور کریں بہتوں کی رائے میں متناقض ومتضاد باتیں ہیں۔

قرآن کسی حدتک شہوت پرستی کی مذمت کرتا ہے کیونکہ سورۃ النزعت کی ۴۰ویں اور ۴۱ویں آیت میں یوں مرقوم ہے کہ مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى یعنی جو کوئی ڈرااپنے رب پاس کھڑاہونے سے اور روکا اس نے نفس کو ہوا سے ۔ سو بہشت ہے اس کا ٹھکانا۔ لیکن یہی کتاب دوسرے مقامات پر اہل اسلام کو کثیر الازواجی کی اجازت دیتی ہے ۔طلاق کا دروازہ کھول دیتی ہے اورلونڈیوں کو استعمال کرنا حلال ٹھہراتی ہے (سورۃ النسا آیت ۳وغیرہ)۔ علاوہ ازیں حضرت محمد کو خاص طور سے زیادہ شہوت رانی کی اجازت دی گئی تھی (سورۃ الاحزاب آیات ۳۷و ۳۸، ۴۹سے ۵۱تک) اور یہ حضرت کے طبعی میلان کا تقاضاونتیجہ تھاجس کا بیان احادیث میں صاف وبرہنہ ہے کہ ہم اس کو یہاں درج کرنامناسب نہیں سمجھتے۔یہاں تک کہ جو لوگ اس دنیامیں شہوت کے غلام نہیں اگر وہ سچے دروفادار مسلمان ہوں تو ان کو بھی سب نیکیوں کے عوض فردوس میں لامحدود شہوت رانی کی اجازت عطا ہو گی (سورۃ الرحمٰن آیت ۴۰سے ۷۸تک۔ سورہ الواقعہ آیات ۱۱سے ۳۹تک ۔ نیز دیکھو مشکواۃ مصابیح ۔صفات الجنۃ)۔ اس معاملہ میں تو تناقض سے بدتر باتیں موجود ہیں لیکن تناقض بھی موجود ہے۔ یقیناً اگر شہوت پرستی اس جہان میں مذموم اورخدایِ قدوس کی نظر میں مکروہ ہے تو فردوس میں اس کی خوشنودی کا باعث نہیں ہوسکتی۔

اس جہان میں اہلِ اسلام کے لئے شراب حرام ہے(سورہ مائدہ آیت ۹۲، نیز دیکھو سورہ البقرہ آیت ۲۱۸)۔ لیکن بہشت میں شراب کا وعدہ ہے (سورہ محمد آیت ۱۶، سورہ دھر آیت ۵، سورۃ التطفیف آیت ۲۵)۔

سیدنا مسیح کے بارے میں بھی قرآن کے بیانات تناقض سے خالی نہیں ہیں۔ بعض آیات میں اس کو محض انسان اور نبی بیان کرتا ہے جیسے کہ اور بڑے بڑے انبیاء ہیں اور اس کی الوہیت کا قطعی وکلی انکار کرتا ہے (سورہ آل عمران آیت ۵۲، سورہ مائدہ آیات ۱۹، ۱۰۹، ۱۱۰، سورہ الزخرف آیت ۵۹)۔ دیگرآیات میں اس کو ایسے بڑے بڑے القاب سے ملقب کرتا ہے جو کسی دوسرے انسان کے حق میں استعمال نہیں کئے گئے مثلاً کلمۃ اللہ (دیکھو سورۃ النسا آیت ۱۶۹)۔وغیرہ ایسے القاب ہیں جو کسی مخلوق کے لئے استعمال نہیں ہوسکتے۔ قرآن فقط مسیح ہی کے حق میں یہ گواہی دیتا ہے کہ وہ کنواری سے پیداہوا (سورہ انبیاء آیت ۹۱)۔ اور وجیہاً[1] فی الدنیا والاخرۃ یعنی مرتبے والا اس جہان میں اور آخرت میں (سورہ آل عمران ۵واں رکوع ۵ویں آیت )سورہ آل

---

[1] بیضاوی کہتا ہے کہ اس دنیامیں وجیہ سے نبوت اور آخرت میں وجیہ سے شفاعت کی طرف اشارہ ہے۔ زمخشری کی بھی یہی رائے ہے۔

عمران کی ۳۶ ویں آیت کے آخری الفاظ وإِنِّي [1] أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ کا مطلب اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے جس کو مسلم نے نقل کیا اور امام غزالی نے اس کا حوالہ دیا ہے کہ دنیا میں ہر ایک بچے کی ولادت کے وقت شیطان حاضر تھا سوای عیسیٰ اورا سکی ماں کی ولادت کے (مشکواۃ المصابیح کتاب اول باب سوم اور کتاب ۲۵ بابِ اول )۔ قرآن مسیح کے معجزات پر شہادت دیتا ہے (سورۃ البقر آیت ۲۵۳ وغیرہ)اور یہ کہتاہے کہ اس نے مٹی سے ایک پرندہ بھی خلق [2] کیا (سورہ آل عمران آیت ۴۸) ۔ اگرچہ خلق کرنے کی قدرت صفاتِ ایزدی میں سے ہے۔ انبیای الوالعزم میں سے وہی ایک ایسا ہے جس کا کوئی گناہ قرآن میں مذکور نہیں ۔ کسی اور نبی کے حق میں قرآن یہ نہیں کہتا کہ اس کی پیدائش روح القدس یا روح اللہ کے وسیلہ سے ہوئی (سورۃ الانبیاء آیت ۹۱)۔ اور وہ تمام مخلوقات کے لئے نمونہ تھا اور روحِ منہ یعنی اللہ کی روح (سورۃ النسا آیت ۱۶۹ )۔ دیگر تمام انبیاء وفات پاگئے لیکن قرآن بتاتا ہے کہ سیدنا مسیح زندہ ہی آسمان پر اٹھالیا گیا (سورۃ النساء آیت ۱۵۶ ، ۱۵۷ )اور مسلمان مسیحیوں کے ساتھ متفق ہوکراس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ آسمان پر زندہ ہے اور زمانہ کے آخر میں پھر آئیگا۔ مسیح کو انشراح صدر اور وضع وزر کی ضرورت نہ تھی جیسا کہ ایک دوسرے کے حق میں مرقوم ہے (سورۃ الانشراح پہلی تین آیات )۔ نہ وہ اس بات کا محتاج تھا کہ اس کے گناہ معاف کئے جاتے (سورہ محمد کی ۲۱ ویں آیت سے مقابلہ کرو)۔ نہ اس کے مومنین اس

[1] میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔
[2] قرآن میں لفظ خلق استعمال کیا گیا ہے۔

کے حق میں اس طرح دعای رحمت کرتے ہیں ﷺ [3] یعنی اللہ اس پر رحم کرے اور سلامتی بھیجے۔ ان تمام باتوں میں اور بہت سی اور باتوں میں مسلمان قرآن کی تعلیم کے مطابق سیدنا مسیح اور تمام دیگر انبیاو بنی آدم میں جو فرق ہے اسے تسلیم کرتے ہیں۔ قرآن حضرت محمد سے بھی ایسی عظمت و بزرگی منسوب نہیں کرتا جیسی مسیح سے کرتا ہے اور باایہنمہ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ مسیح کی جگہ حضرت محمد کو تمام بنی آدم کا پیشوا اور سردار قرار دے ۔ اس میں سخت قسم کا تناقض موجود ہے کیونکہ قرآن جیسا کہ اس باب کے آخر میں اور آئندہ باب میں بیان کیا جائیگا معجزانہ پیدائش۔ بے گناہی ، معجزات کی قدرت اور فی الحقیقت اعلیٰ و پاک چال چلن حضرت محمد سے منسوب نہیں کرتا۔

قرآن کی ایک بڑی تعلیم یہ ہے کہ ہر ایک فردِ بشر کے اعمال اور اس کی آخرت میں سعادت وشقاوت کا فیصلہ تقدیر سے ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل کی چودھویں آیت میں یوں مرقوم ہے وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَآئِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا یعنی اور جو آدمی ہے لگادی ہم نے اس کی بُری قسمت اس کی گردن سے اور نکال دکھائینگے اس کو قیامت کے دن لکھا کہ پائیگا اس کو کھلا۔ سورہ ابراہیم کی چوتھی آیت اور سورہ المدثر کی ۳۴ویں آیت میں قرآن صاف کہتا ہے کہ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ یعنی گمراہ کرتا ہے اللہ جس کو چاہے اور

[3] جیسا کہ مشکواۃ کے صفحہ ۸۷ پر حضرت محمد کے حق میں دعا کرنے کا حکم ہے۔ کوئی اور نبی اپنی اُمت کی دعا کا محتاج نہیں لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ حضرت محمد محتاج ہیں۔

ہدایت کرتا ہے جس کو چاہے ۔یہی تعلیم سورہ بقر کی پانچویں اور چھٹی آیت اور
سورۃ النسا کی ۹۰ویں آیت اور سورۃ الانعام کی ۱۲۵ویں آیت اور سورۃ
الاعراف کی ۱۷۷ویں اور ۱۷۸وسورہ ھود آیت ۱۲۰ اور سورہ سجدہ آیت
۱۳ میں مرقوم ہے کہ خدا نے کہا لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ
أَجْمَعِينَ یعنی البتہ بھرونگا دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے اور یہ کہ ان کو
پیدا کرنے سے اسکی غرض بھی یہی تھی لیکن ساتھ ہی دیگر آیات میں مرقوم ہے
کہ لوگ دنیا میں مسلمان ہونے کے سبب سے اجر عظیم پائینگے اور اگر مسلمان
نہیں ہونگے تو ان کو سخت سزا ملیگی۔اگر ہر ایک فعل پہلے ہی سے مقدر ہے
اور انسان آزاد مرضی کے انعام سے محروم ہے تو صاف ظاہر ہے کہ انسان کی
طرف سے نہ ثواب ہے نہ خطا، نہ نیکی نہ بدی اور نہ وہ سزا وجزا کا مستحق ہے اور
اگر تقدیر نے پیشتر ہی سے سب کچھ مقدر کر رکھا ہے تو تمام اوامر و نواہی بالکل
بے معنی وبے سود ہیں کیونکہ انسان میں اطاعت وعدول کی قدرت نہیں ۔ تو بھی
قرآن میں جو خدای عالم الغیب کی طرف سے آنے کا دعویدار ہے اوامر و نواہی
مندرج ہیں۔ قرآن کی بعض آیات میں حضرت محمد سے کہا جاتا ہے کہ لوگوں کو
مسلمان بنانے میں ان کی کوشش بے سود ہے کیونکہ خدانے خود ہی ان لوگوں
کے لئے ایمان لانا ناممکن بنادیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقر کی پانچویں اور چھٹی آیت
میں یوں مرقوم ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُواْ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ
تُنذِرْهُمْ لاَ يُؤْمِنُونَ خَتَمَ اللّهُ عَلَى قُلُوبِهمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى
أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عظِيمٌ یعنی وہ جو منکر ہوئے ۔ برابر ہے
ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ وہ نہ مانینگے ۔ مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر
اوران کے کانوں پر اوران کی آنکھوں پر پردہ ہے اوران کے لئے بڑی مار ہے۔

اس پر بھی آنحضرت کو حکم ہے کہ ان کو مسلمان بنانے کی کوشش کریں۔
زبردستی وجبراً نہیں بلکہ نرمی وملایمت سے ۔ چنانچہ سورۃ البقرہ کی ۲۵۷ویں
آیت میں مرقوم ہے لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ یعنی دین میں زبردستی نہیں۔ سورہ
نور کی ۵۳ویں آیت میں حضرت محمد کو یوں حکم دیا گیا ہے قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا
حُمِّلْتُمْ وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ
یعنی تو کہہ مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا۔ پھر اگر تم پھروگے تو اس کا ذمہ ہے جو
بوجھ اس پر رکھا اور تمہارا ذمہ جو بوجھ تم پر رکھا اور اگر اس کا کہا مانو تو راہ پر آؤ گے
اور پیغام والے کا ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا کھول کر۔ اسی طرح سورۃ الغاشیہ کی
۲۱ویں اور ۲۲ویں آیت میں آنحضرت کو یہ حکم ملتا ہے فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ
مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ یعنی سو سمجھا۔ تیرا کام یہی ہے سمجھانا۔
تو نہیں ہے ان پر داروغہ لیکن دیگر مقامات پر اس کی متناقض ومتضاد تعلیم مندرج
ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ النبی بالسیف نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خدا نے آپ
کو یہ حکم دے دیا ہے کہ جبراً اسلام کو پھیلائیں چنانچہ ایسی عبارات میں اس امر
کی تعلیم پائی جاتی ہے جیسی کہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔ سورۃ البقرہ آیات
۸۶ سے ۸۹ تک ، ۲۱۲۔ سورۃ النسا آیات ۷۶ ، ۹۱، سورۃ الانفال آیت
۴۰، سورۃ الفتح آیت ۱۶ ۔ سورۃ التحریم آیت ۹، ان آیات میں تناقض وتبائن
کی کوئی حد نہیں ہے۔ یہی کہنا کافی نہیں کہ بعد کی آیات پہلی بعض آیات کو
منسوخ کردیتی ہے جیسا کہ سورۃ البقر کی ۱۰۵[1] ویں آیت میں مرقوم ہے۔ یہ

---

[1] سورۃ النحل کی ۱۰۳ آیت سے مقابلہ کرکے دیکھو۔

تناقض وتبائن کو تسلیم کرنے اور اس کے وجود کے عیب کو چھپانے کی تدبیر ہے۔ سورۃ البقر کے آٹھویں رکوع کی پہلی آیت اور سورہ آل عمران کے نویں رکوع کی پانچویں آیت کا باہم مقابلہ کرنے سے ایک بہت اچھی مثال ملتی ہے۔ آیت مقدم الذکو میں مرقوم ہے کہ مسلمان ویہودی اور نصاریٰ وصابئین نجات یافتہ ہیں چنانچہ یوں مندرج ہے إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَالَّذِينَ هَادُواْ وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ یعنی جولوگ مسلمان ہوئے اورجولوگ یہودہوئے اور نصاریٰ اور صائبین ، جو کوئی ایمان لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور کام کیا نیک تو ان کو ہے ان کی مزدوی اپنے رب کے پاس اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں۔ لیکن موخرالذکرآیت میں مرقوم ہے کہ فقط مسلمانوں ہی کا دین سچا دین ہے چنانچہ یوں مندرج ہے ومن تبیغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھوفی الاخرۃ من الخسرین یعنی جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے وہ اس سے ہر گز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں خراب ہے۔ قرآن سے اور متناقض ومتضاد عبارات پیش کرنا کچھ مشکل نہیں ہے خصوصاً مسلمان اہل علم تسلیم کرتے ہیں کہ کم ازکم ۲۲۵ آیات منسوخ ہوچکی ہیں۔ ان منسوخ شدہ آیات میں سے بہت سی وہ ہیں جن میں عدل وانصاف اور دینی آزادی کی تعلیم ہے۔ ہم سے یہ ماننے کی درخواست کی جاتی ہے کہ غیر متغیر ولاتبدیل خدا نے بعد میں ظلم وستم اوربے رحمی کو جائز قرار دیا اورمسلمانوں پر اُن کی مرضی کے خلاف جنگ کو فرض کردیا تاکہ دوسرے لوگوں کو جبراً اپنے دین میں داخل کریں (سورۃ البقر کی ۲۱۲ ویں اور ۲۱۳ آیت کاسورہ توبہ کی پانچویں اورانیتسویں آیت سے مقابلہ کرو)۔

قرآن میں ایک بڑی نمایاں قسم کا تناقض پایا جاتا ہے جس پر مسلمانوں کو خوب غور کرنا چاہیے ۔ یہ قرآن اور بائبل کا باہمی تناقض ہے ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن توریت وانجیل کی تصدیق وحفاظت کی غرض سے نازل کئے جانے کا مدعی ہے لیکن بہت سی باتوں میں دونوں کی ضدو نقیض ہے اور یہ باتیں جن میں قرآن بائبل کی ضد ثابت ہوتا ہے انجیل کی بڑی بڑی تعلیمات وحقائق ہیں مثلاً پیشینگوئی کے مطابق مسیح کا صلیب پر جان دینا۔ اس کا تمام جہان کے گناہوں کے لئے کفارہ دینا۔اس کی الہیٰ ذات ۔ اس کا مردوں میں سے جی اٹھنا اوریہ کہ فقط وہی اکیلا بنی آدم کی روحوں کو بچاسکتا ہے۔ یہ توصاف ظاہر ہے کہ غیر متغیر ولاتبدیل ذاتِ باری تعالیٰ کا کوئی بعد کا الہام اس کے ازلی ارادہ ۔اس کی مقرر کردہ راہ نجات ۔ اس کے وعدوں اوراس کی اخلاقی شریعت اور الہیٰ تعلیم کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ علاوہ بریں قرآن کا وحیِ آسمانی ہونے کا دعویٰ اور حضرت محمد کا نئے پیغام کے ساتھ پیغمبر ہونے کا دعویٰ عہدِ عتیق کی تعلیمات کے خلاف ہے جیسا کہ سیدنا مسیح کے فرمان سے صاف ظاہر ہے" آسمان[1] اور زمین ٹل جائینگے لیکن میری باتیں ہر گز نہ ٹلینگی" اور پولوس رسول نے فرمایا ہے "اگر ہم[2] یاآسمان کا کوئی فرشتہ بھی اس خوشخبری کے سوا جوہم نے تمہیں سنائی ہے کوئی اور خوشخبری تمہیں سنائے توملعون ہو" لہذا کسی نئے الہام کی گنجائش نہیں خواہ اس کا لانے والاجبرائیل ہو یا کوئی اور انسان یا فرشتہ۔ اس میں قرآن آپ ہی اپنی ضدو نقیض ٹھہرتا ہے کیونکہ پہلے تو بائبل کی سچائی اور

---

[1] متی ۲۴: ۲۵، مرقس ۱۳: ۳۱۔لوقا ۲۱: ۳۳۔ یوحنا ۱۲: ۴۸سے مقابلہ کرو۔

[2] گلتیوں ۱: ۸، ۹۔

الہام کی تصدیق کرتا ہے اور پھر اس کی بڑی بڑی تعلیمات کی متضاد ومتناقض تعلیم دیتا ہے۔

قرآن بائبل کی تصدیق کے لئے آنے کا دعویدار ہے لیکن بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بائبل کی متضاد تعلیم دے کر آپ ہی اپنی ضد ٹھہرتا ہے۔ مثلاً سورہ مریم کی ۲۳ویں آیت میں مرقوم ہے کہ سیدنا مسیح کی ولادت ایک کھجور کے درخت کے نیچے ہوئی درحالیکہ انجیل میں لکھا ہے کہ اس کی ولادت کارواں سرائے میں واقع ہوئی اور وہ چرنی میں رکھا گیا (لوقا دوسرا باب)۔ قرآن کہتا ہے کہ اس نے ایام رضاع میں ہی گھوارے سے کلام کیا (سورہ آل عمران آیت ۴۶، سورہ مائدہ آیت ۱۰۹۔ سورہ مریم آیت ۳۱)۔ اور لڑکپن میں مٹی سے پرندے خلق کرکے اڑادئے (سورہ آل عمران آیت ۴۸، سورہ مائدہ آیت ۱۱۰)۔ یہ معجزات ہیں لیکن انجیل میں یہ حقیقت مذکور ہے کہ سیدنا مسیح نے پہلا معجزہ اس وقت دکھایا جب ۳۰سال کی عمر میں اس نے انجیل کی بشارت شروع کی (لوقا ۳: ۲۳، یوحنا ۲: ۱۱)۔ اسی طرح اخلاق وفرائض کے باب میں قرآن وانجیل میں باہمی تناقض ہے۔ سیدنا مسیح نے یہ تعلیم دی کہ اپنے دشمنوں سے بھی محبت رکھو لیکن حضرت محمد نے قرآن میں یہ حکم سنایا کہ خدا کی راہ میں لڑو۔ مسیح نے فرمایا کہ قیامت میں بیاہ شادی نہ ہوگی بلکہ لوگ آسمان پر فرشتوں کی مانند ہونگے (متی ۲۲: ۳۰ومرقس ۱۲: ۲۵، لوقا ۲۰: ۳۵) درحالیکہ قرآن یہ تعلیم دیتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے فردوس میں شہوت پرستی ومستی کی قریباً کوئی حد نہ ہوگی۔

اس دلیل کو یہ کہکر توڑنا ناممکن ہے کہ یہود ونصاریٰ کی موجودہ کتب مقدسہ محرف ہیں کیونکہ اس کتاب کے شروع میں ہم اس کا پورا جواب دے چکے ہیں۔ ہر ایک کتاب کے بارے میں جو قرآن کی طرح الہام الہیٰ اور وحی آسمانی ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی بڑی آسانی سے فیصلہ ہوسکتا ہے۔ سب لوگ اس بات پر متفق ہونگے کہ بعد کی کتاب کے مصنف کو پہلی کتابوں کے مندرجہ مضامین کے بارے میں صحیح علم نہ تھا۔ اس کے بتانے والے جاہل تھے جنہوں نے بائبل کو دیکھنے کے عوض میں مشہور ومروجہ افسانوں پر تکیہ کیا لیکن قرآن کے متعلق ہم کوئی اس قسم کا نتیجہ نکالنے پر رضامند نہیں ہیں۔ ہم اپنے مسلمان احباب سے التماس کرتے ہیں کہ وہ خود ہی اپنے لئے فیصلہ کریں۔ معزز پڑھنے والا غالباً یہ تسلیم کریگا کہ قرآن کو بغور مطالعہ کرنے سے اب تک ہم کو اس کے الہامی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

اگر قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا تولازم تھا کہ اس کی تمام تعلیمات انجیل کی تعلیمات سے اعلیٰ وافضل اور اخلاقی پہلو سے زیادہ خدا کی شان کے شایاں ہوتیں جس طرح سے انجیل کی تعلیمات اس لحاظ سے توریت کی تعلیمات سے بہت اعلیٰ وافضل ہیں۔ لیکن یہ حال نہیں ہے کیونکہ انجیل میں خدا کے ایماندار وفادار بندوں کے اجر کا وعدہ یہ نہیں کہ بہشت میں کھانا پینا اور دیگر جسمانی لذات سے حظ اٹھانا ہوگا بلکہ روحانی شادمانی مثلاً قلبی اطمینان، پاکیزگی حب الہیٰ اور ذات باری تعالیٰ کی خدمت ان کا حصہ بخرہ ہے۔ پس انجیل ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ جو لوگ اس دنیامیں سیدنا مسیح پر حق ایمان لاتے اور اسکی محبت میں قائم رہتے ہیں اور مرنے تک وفاداری کے ساتھ خدا کی فرمانبرداری کرتے ہیں وہ آخر کار اس بلند وپاک مکان میں داخل ہونگے جو سیدنا مسیح نے ان

کے لئے تیار کر رکھا ہے چنانچہ یوں مرقوم ہے " اس کے بندے[1] اس کی عبادت کرینگے اور وہ اس کامنہ دیکھیں گے اوراسکا نام ان کے ماتھوں پر لکھا ہوا ہوگا" ۔انجیل امورِ دین میں جبر کومنع کرتی ہے اور ہر ایک فرد بشر کوآزادی دیتی ہے کہ اپنی مرضی سے اگرچاہے تو اپنے لئے حق کو قبول کرے اوراگر نہ چاہے تو نہ کرے۔ اگر کوئی انسان سیدنا مسیح پر ایمان لانا چاہتا ہے تو روح القدس کے انعام سے وہ ایمان لانے اور روحانی پیدائش وہدایت اور نجات حاصل کرنے کی توفیق پاتاہے۔جولوگ مسیح کورد کرتےہیں ان کواس پرایمان لانے کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا لیکن ان کو صاف بتلادیا جاتا ہے کہ وہ اسے رد کرنے سے اپنے آپ پر سزا[2] کا حکم صادر کراتے ہیں ۔ پھر قرآن کے برخلاف وبرعکس انجیل ان کودلی آرام اور خدا کے مقبولِ نظر ہونے کا یقین دلاتی ہے جو سیدنا مسیح کے وسیلہ سے اس کے پاس آتے ہیں۔ ہر ایک سچا مسیحی اپنے ذاتی تجربہ سے ان حقیقتوں کو خوب جانتا ہے۔ لیکن قرآن کی تعلیم کے مطابق ہر ایک شخص عمر بھر اس شک میں مبتلارہتا ہے کہ کہیں وہ ان بد قسمت وبدبخت لوگوں میں سے تو نہیں جن کو خدا نے جہنمی ٹھہرایا اورآتش دوزخ کو انہی کے لئے پیدا کیاہے۔انجیل (بشارت) اپنے نام کے مطابق یہ خوشخبری سناتی ہے کہ اللہ جل شانہ نے کسی ایک مخلوق کو بھی ابدی عذاب وہلاکت کے لئے خلق نہیں کیا بلکہ برعکس اس کے " وہ چاہتا[3] ہے کہ تمام بنی آدم نجات پائیں اور سچائی کی پہچان تک پہنچیں"۔ اورتاکہ ایسا ہونا ممکن ہواس نے اپنے فرزندِ توحید

[1] مکاشفہ ۲۲: ۳، ۴۔

[2] یوحنا۳: ۱۸تا۲۱۔

[3] ۱ تیمتھیس ۲: ۴

کو دنیامیں بھیج دیا"۔ لہذا انجیل صفائی کے ساتھ یہ تعلیم دیتی ہے کہ کوئی بھی ابدی ہلاکت میں پڑیگامگر فقط وہ لوگ جو مسیح میں پیش کی گئی محبت ورحمت الہٰی کو رد کرتے ہیں اوراس پر ایمان نہیں لاتے اوراس کے دعوے کی سچائی کو پہچانتے اورمانتے نہیں اور نہ اس کو اکیلاسچا نجات دہندہ تسلیم کرتےہیں جوخدا اورانسان کے درمیان سچا درمیانی ہے بلکہ نور کی جگہ تاریکی کو پسند کرتےہیں کیونکہ ان کے کام بُرے ہیں اورحق کی محبت کوقبول نہیں کرتے تاکہ نجات پائیں۔

اگر قرآن بنی آدم کے لئے خدا کا آخری اورکامل ترین الہام ہوتا تو واجب واللازم تھا کہ خدا کی قدوسیت اوراس کے عدل ورحم کو ہمارے سامنے بہتر صورت میں پیش کرتا ۔ الہٰی شریعت کی اطاعت وفرمانبرداری کی غرض خود غرضی سے خالی بیان کرتا اور گناہ کے باب میں زیادہ عمیق وروحانی تعلیم دیتا۔ راہِ نجات، روحانی پاکیزگی کی ضرورت ، خدا کی ہم سے محبت اورہماری خدا سے محبت کی ضرورت اورحق اللہ اورحق العباد کی ہم کو زیادہ صاف وصریح تعلیم دیتا۔ دل کی پاکیزگی کی ضرورت پر کتبِ پیشین سے زیادہ زور دیتا اور بہشتی زندگی کی انجیل سے بڑھ کر اعلیٰ وافضل اور پاک تر تصویر کھینچتا۔ جنہوں نے قرآن اور بائبل دونوں کو غور سے پڑھاہے وہ خود فیصلہ کرسکتےہیں کہ ایسا ہی حال ہے یا نہیں۔

جب یہ دریافت کرنے کے لئے قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں کہ یہ من جانب اللہ ہے یا نہیں تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ " اگر یہ الہام الہٰی اور وحی آسمانی نہیں ہے توپھر اس کی اصل کیاہے؟ اس سوال کا خاطر خواہ کامل جواب ینابیع الاسلام میں دیا گیاہے۔ اہل علم بیان کرتےہیں کہ بہت سے قصصِ قرآن

اور مسلمانوں کی بہت سی دینی رسوم دیگر ادیانِ عالم سے ماخوذ ہیں۔ اس بیان کی تفصیل ینابیع الاسلام میں مرقوم ہے۔ اس میں پڑھنے والے کو زرتشتی وہندی اور قدیم مصری اور بہت سی دیگر اقوام کی کتابوں سے انتخابات نظر آئینگے۔ ینابیع الاسلام کے مصنف کی رائے میں یہ انتخابات ہی زیادہ تر قرآن کی اصل ماخذ ہیں۔ وہ اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ بہت کچھ ان جعلی وناقابل اعتماد افسانوں سے ماخوذ ہے جو حضرت محمد کے ایام میں بے علم یہود و نصاریٰ میں رائج تھے اگرچہ بائبل میں ان افسانوں کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

علاوہ بریں جو کوئی زید ابن عمر وابن نفیل کے وہ اشعار پڑھے جن کو ابن اسحاق اور ابن ہشام نے سیرۃ[1] الرسول میں نقل کیا ہے اسے صاف معلوم ہوجائیگا کہ ذیل کی باتیں جن کی قرآن میں تعلیم دی گئی ہے حضرت محمد کے دعویٰ نبوت سے پیشتر زید نے ان کی تعلیم دی تھی۔ وہ باتیں یہ ہیں :(۱۔) توحیدِ الہیٰ کا اقرار (۲) لات وعزیٰ اور دیگر بت پرست عربوں کے معبودوں کی پرستش کی تردید۔(۳۔) فردوس میں خوشی وخرمی کا وعدہ۔(۴۔) بدکاروں کو عذابِ دوزخ کی خبر۔(۵۔) بے ایمانوں پر قہر الہیٰ کی تہدید ۔(۶)۔ الرب الرحمن اور الغفور کے القاب سے خدا کو ملقب کرنا۔(۷۔) شیر خوار لڑکیوں کوزندہ دفن کرنے کے رواج کی نہی۔ اس کے علاوہ زید ابن عمر اور دیگر حنفاکہتے تھے کہ ہم دینِ ابراہیم کی تلاش میں ہیں۔ حضرت محمد نے لوگوں کو دینِ ابراہیم کی طرف بلانے کے لئے بھیجے جانے کا دعویٰ کیا اور قرآن بار بار حضرت ابراہیم کو حنیف[2] بتاتا ہے۔ علاوہ بریں کتاب[3] الاغانی اس حقیقت کے اظہار میں سیرۃ الرسول کے ساتھ متفق ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرنے سے پیشتر حضرت محمد نے زید ابنِ عمرو سے ملاقات اور گفتگو کی تھی۔

ینابیع الاسلام کا مصنف اس بات کو ثابت کرنے کی دلائل بہم پہنچاتا ہے کہ حضرت محمد کے معراج کا بیان جو سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں مندرج ہے اوراحادیث میں پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر اس حکایت پر مبنی ہے جو ایک پرانی فارسی کتاب" ارتاویرافنامہ" میں مندرج ہے اور جس میں مذکور ہے کہ دیندار زرتشتی جوان کیونکر آسمان پر چڑھ گیا اور جب واپس آیا تو جو کچھ اس نے دیکھا تھا یادیکھنے کا دعویٰ کیا تھا بیان کیا۔

عربی مورخ ابوالفدا بہت سے پرانے عربی رواج کورسوم کا ذکر کرتا ہے جن کو اسلام نے قرآن واحادیث کی منظوری سے اختیار کرلیا چنانچہ وہ کہتا ہے " زمانہ جاہلیت کے عرب ایسے کام کیا کرتے تھے جن کواسلام نے اختیار کرلیا کیونکہ وہ اپنی ماؤں یا بیٹیوں سے نکاح نہیں کیا کرتے تھے اوران کے درمیان دوبہنوں سے نکاح کرنا نہایت ہی مکروہ تھا اور جو کوئی اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرتا تھا اس کو ملامت کرتے تھے اسے ضیزن کہتے تھے۔ علاوہ بریں وہ کعبہ کا حج کرتے تھے اور مقدس مقامات کی زیارت کیا کرتے تھے۔ وہ احرام باندھتے اورطواف کرتے تھے اور دوڑتے اورپتھر پھینکتے اور تمام مقامات پر کھڑے ہوتے تھے" (دیکھو سورۃ الحج آیت ۲۷، ۲۸، ۳۰۔ سورۃ البقر آیت ۱۳۹، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۵۳، ۱۹۰، ۱۹۲، ۱۹۳ سے ۱۹۵ تک۔ سورہ مائدہ آیت ۹۸ وغیرہ)۔ ابوالفدا اور رسوم کا بھی ذکر کرتا ہے جواسلام نے

---

[1] جلد اول صفحہ ۷۷

[2] سورہ آل عمران آیت ۹۵۔ سورۃ النساآیت ۱۲۴، سورہ انعام آیت ۱۶۲

[3] تیسرا حصہ صفحہ ۱۵

بُت پرست عربوں سے اختیار کرلیں۔ مثلاً بعض اقسام کی نجاست وناپاکی سے طہارت ، بالوں کی تقسیم کرنا اور ناخن کا ٹنا وغیرہ۔ وہ کہتا ہے کہ بُت پرست عرب ختنہ بھی کرتے تھے اور چور کا ہاتھ کاٹ ڈالتے تھے۔ بیشک بعض مسلمان ابن اسحاق[1] کی طرح کہینگے کہ یہ رسوم حضرت ابراہیم کے زمانہ سے چلی آتی تھیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ختنہ کے باب میں یوں کہنادرست ہے لیکن دیگر رسوم مذکورہ بالاکے بارے میں ایساکہنا سچ بات نہیں ہوسکتا۔ یہ مان لینا خلافِ عقل نہیں ہے کہ نیا الہام عنایت کرنے پر بھی ممکن ہے کہ خدا بہت سی مروجہ رسوم کو قائم رکھے لیکن یہ اس عقیدہ کے خلاف ہے کہ ایسی رسوم اورقرآن کو اہلِ عرب کے وجود سے کروڑوں سال پیشتر آسمان پر لوحِ محفوظ پر لکھ رکھا تھا۔

بعض اوقات مسلمان کہتے ہیں کہ قرآن عرفانِ الہیٰ ونیک اخلاق اور بہتر سلطنت وحکومت کے بارے میں اور آئندہ زندگی کے متعلق اس قدر تعلیم دیتا ہے کہ اس کا من جانب اللہ ہونا لابدی ٹھہرتا ہے ۔ بیشک اگر ان باتوں کے بارے میں قرآن کی تعلیم بائبل کی تعلیم سے اعلیٰ وافضل ہوتی تو یہ دلیل بہت مضبوط اور قابلِ قدر ٹھہرتی لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا کی ذات وصفات کے بارے میں قرآن کی تعلیم انجیل کی تعلیم سے اعلیٰ وافضل نہیں ہے۔ فی الحقیقت قرآن کا یہ بیان کہ خدا نے جن[2] وانس سے جہنم کو بھرنے کا قصد کر رکھا ہے اور ہر ایک فرد بشر کی قسمت اس کی گردن پر باندھ دی ہے اور حضرت محمد کو معمولی مسلمانوں سے بہت زیادہ شہوت رانی کی اجازت دیدی ہے اور اشاعت اسلام کے لئے جہاد کا حکم دیدیا ہے اورایسے ہی اور بہت سے اہم امور ہیں جن میں قرآنی تعلیمات موسوی شریعت کی تعلیمات سے بھی بہت ہی ادنی درجہ کی ہیں۔ عہد عتیق میں کہیں بھی کثیر الازواجی کی صاف طورسے اجازت نہیں ہے اگرچہ کچھ عرصہ تک یہودیوں نے چپ چاپ سے اس کو جائز قرار دے دیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت کہ آدمی کے لئے خدا کا قانون ہمیشہ ایک بیوی رکھنے کا تھا۔ پیدائش ۲: ۱۸ - ۲۴ سے عیاں ہے اور سیدنا مسیح نے اس کی صاف تعلیم دی ہے (متی ۱۹: ۳تا ۹، مرقس ۱۰: ۲تا ۱۲)۔ سیدنا مسیح نے اس دنیا میں بھی شہوت کی نظر تک کوممنوع فرمایا ہے(متی ۵: ۲۸)۔ لیکن قرآن مسلمانوں کو یہ امید دلاتا ہے کہ خدا کے حضور میں بھی بہشت میں لامحدود مستی وشہوت پرستی میں غرق رہینگے۔ یہ تعلیم ہرگز ہرگز ایسی نہیں ہے جس کے وسیلہ سے اس دنیا میں دل کی پاکیزگی حاصل ہوسکے۔ بہت سلطنت وحکمرانی کے بارے میں ہم پوچھتے ہیں کہ یہ کونسے اسلامی ممالک میں پائی جاتی ہے؟ اور گذشتہ زمانہ میں کب کہیں پائی جاتی تھی؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنا اور یہ معلوم کرنا کہ بہتر حکومت اور قرآن کی تعلیم میں فی الحقیقت کیا نسبت ہے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن آئندہ زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے ۔ خاص کرعذابِ دوزخ اور لذات بہشت کے بارے میں ۔ عذاب دوزخ کے متعلق ہمیں اس موقع پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن دوزخ کے بارے میں ہمیں اپنے مسلمان احباب کو دو باتیں ضرور بتانا ہے۔ اول سورہ مریم کی ۷۲ویں آیت ہے جس میں یوں مرقوم ہے وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا یعنی اور کوئی نہیں تم میں جو نہ وارد ہوگا اس میں ۔ ہوچکا تیرے رب پر ضرور مقرر۔ مفسرین نے اس کو اچھی صورت میں پیش

---

[1] سیرۃ الرسول حصہ اول صفحہ ۲۷

[2] سورہ ہود آیت ۱۲۰ ۔ سورہ سجدہ آیت ۱۳ ۔

کرنے کی بہت کوششیں کی ہیں۔ دوم وہ حدیث ہے جس میں مرقوم ہے کہ فرقہ ہای متعددہ اہلِ اسلام میں سے فقط ایک فرقہ ایسا ہے جس کے لوگ نجات پائینگے۔ اگر ہم مسلمان ہوتے تو یہ دونوں باتیں ہم کو ہمیشہ موت اور روزِ قیامت کے خیال سے لرزاں و ترساں رکھتیں۔ لہذا غالباً یہی باعث ہے کہ سچے مسیحی تو بڑی خوشی اور امید کے ساتھ قیامت کے منتظر ہیں اور مسلمانوں کا خوف وہراس سے خون خشک ہوتا رہتا ہے۔ جو لذات قرآن بتاتا ہے کہ نجات یافتہ لوگوں کے لئے بہشت میں تیار ومہیا کی گئی ہیں مناسب ہے کہ ہم ان کی ماہیت کا بھی کچھ تھوڑا سا ذکر کریں۔ ان کا بیان قرآن میں مقامات ذیل میں مرقوم ہے۔ سورۃ البقر آیت ۲۵۔ سورۃ النسا آیت ۶۰ ، سورہ رعد آیت ۳۵، سورہ یسین آیات ۵۵ سے ۵۸ تک۔ سورۃ الصفت آیات ۳۹ سے ۷۴ تک ۔ سورہ محمد آیات ۱۶ ، ۱۷ ۔ سورۃ الرحمٰن آیات ۴۶ سے ۷۸ تک۔ سورۃ الواقعہ آیات ۱۱ سے ۳۷ تک ۔سورۃ الدھر آیات ۵، ۱۱ ، سے ۲۲ تک ۔ سورہ المرسلت آیات ۳۱ سے ۳۶ تک۔ سورۃ التطفیف آیات ۲۲ سے ۲۸ تک۔ علاوہ اس سب کے امام غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین ۔ عین الحیات ۔ تفسیر طبیان اور دیگر کتابوں میں احادیث کے مطابق مفصل بیانات مندرج ہیں۔ البخاری نے اس مضمون پر الصاحب میں تمام صحیح احادیث کو جمع کیا ۔لیکن مکمل بیانات میں سے ایک مشکواۃ[1] المصابیح میں مندرج ہے جو بہشت اور اہلِ بہشت کے بیابان میں پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن واحادیث کے مطابق مسلمانوں کی مبارک بادی آخرت میں ان باتوں میں ہوگی کہ لباس فاخرہ پہنینگے ۔ بڑے بڑے شاندار پلنگوں پر تکیہ لگا کر بیٹھینگے ۔ نہایت نفیس کھانے اور خوش مزہ پھل کھائینگے ۔ غایت درجہ کی عمدہ شراب نوش کرینگے جس سے دردسر نہیں ہوگا اور حوروں کی افواج کے ساتھ بے تکلفی سے عیش کرینگے۔ یہ بہشت جسمانی اور اس میں وہ چیزیں مہیا کی گئی ہیں جن سے آدمی کی جسمانی خواہشیں پوری ہوتی ہیں لیکن اس میں مقدس وپاک باطن مردوزن کے لئے بالکل جگہ نہیں ہے۔ پاک دل لوگ اس بہشت سے کوسوں دور بھاگینگے جیسے کہ وہ اس دنیا میں شکم پرستی ومیخواری اور فسق وفجور سے دور بھاگتے ہیں۔ اس قسم کا فردوس خدا کا مہیا کردہ نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ذات باری تعالیٰ قدوس ہے اور اس کی ذاتِ پاک گناہ اور ہر طرح کی ناپاکی کی مخالف ہے۔ روحِ انسانی جو عرفان وعبادت الہیٰ کے لئے پیدا کی گئی۔ جس کو ہمیشہ اپنے خالق کی محبت وقربت میں روحانی راحت تلاش کرنا چاہیے ایسی جسمانی لذات سے کب راحت واطمینان حاصل کرسکتی ہے؟ اس جہاں میں بھی عیاش لوگ آخر کار اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جسمانی لذات کا آخر خوشی نہیں بلکہ کراہیت ہے۔ لہذا بہشت کے قرآنی بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن من جانب اللہ ہے۔ محی الدین مفسر نے اس حقیقت کو محسوس کیا ہے اوروہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ تمام بیانات استعارات[2] وکنایات ہیں لیکن اجماعِ اسلام کے نزدیک وہ بدعتی ہے اور عام مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہے کہ قرآن واحادیث جو کچھ کہتے ہیں وہی ان کا مطلب ہے۔

---

[1] صفحات ۴۸۷ سے ۴۹۱ تک۔

[2] سورۃ الواقعہ کی ۱۸ ویں آیت کی تفسیر میں وہ لکھتا ہے بالواب واباریق من خمور الارادۃ المعرفۃ والمحبۃ والعشق والذوق ومیاہ الحلم والعلوم ۔ الخ

مضامین مندرجہ قرآن پر غور کرتے وقت ہمیں اس بات کی طرف بھی توجہ دلانا ضرور ہے کہ قرآن بنی آدم کی روحانی ضروریات اور آرزوؤں کو پورا نہیں کرتا حالانکہ الہام الہیٰ کی ضرورت کے بڑے بڑے اسباب میں سے یہ ایک سبب ہے کیونکہ اللہ جل شانہ نے یہ آرزوئیں انسان کے دل میں رکھ دی ہیں تاکہ وہ جب تک حق تعالیٰ میں راحت حاصل نہ کرے تب تک ان کے سبب سے بالکل بے چین رہے۔ بعض مسلمان مصنفین کہتے ہیں کہ قرآن لوگوں کو ڈراتا اور رلاتاہے جیسا کہ حدیث میں مرقوم ہے کہ جب قرآن کا ایک حصہ اے بی سینیا کے النجاشی کے سامنے پڑھا گیا تو (اگرچہ وہ عربی نہیں سمجھتا تھا)وہ روپڑا۔ لیکن ایسے مصنفین بھی صداقت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے ان کو اطمینان قلبی حاصل ہوتا ہے جیسا کہ سیدنا مسیح سے اس کے تمام سچے ایمانداروں کو حاصل ہوتا رہاہے اور اب بھی ہوتا ہے(یوحنا ۱۴: ۲۷) برعکس اس کے بعض آیات قرآنی مثلاً سورہ مریم کی ۷۱ویں و۷۲ویں آیت اور تقدیر کی تعلیم عقلمند اور غور کرنے والے مسلمانوں کو موت سے دائمی وحشت ودہشت میں رکھتی ہیں۔ قرآن خدا کو بھی ایسے طور سے ظاہر نہیں کرتا کہ انسان اس کو جان سکے۔ جو کتابیں مسلمان مصنفین مسلمانوں کی ہدایت ورہبری کے لئے لکھتے ہیں ان سے بھی یہ حقیقت صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے لئے خدا کو جاننا بالکل غیر ممکن ہے ۔مثلاً خوند ملا محمد نقی کاشانی اپنی کتاب ہدایت الطالبین[1] دراصول الدین کے صفحہ ۴۱، ۴۳ پر یوں لکھتاہے ۔ شناختن ذاتِ واجب الوجود جل شانہ محال است ۔ ۔۔۔ مخلوق را با خالق وممکن را با واجب وحادث را با قدیم وفانی را با باقی ،ہیچگو نہ مناسبتے نیست کہ تواند ذاتِ آنرا شناخت ۔ وازاین جہت است کہ پیغمبر ما صلعم کہ افضل ازہمہ پیغمبر ان است فرمودہ ما عرفناک حق معرفتک ۔ اب تو یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ اگر قرآن عرفانِ الہیٰ تک نہیں پہنچاتا اوراگر حضرت محمد نے خود اس کو تسلیم کرلیاہے کہ آنحضرت کا عرفان الہیٰ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا نہیں ہے تو اسلام اس نہایت اہم معاملہ میں انسان کی ضروریات کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔

پھر قرآن یہ تعلیم مطلق نہیں دیتا کہ ہر ایک فردِ بشر کے لئے اللہ جل شانہ کے حضور پہنچنے سے پیشتر پاک دل ہونا ضروری ہے ۔ برعکس اس کے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں قرآن میں ایسی عبارات موجود ہیں جو انسان کے پاک دل ہونے کے خلاف ہیں اور جن سے ہر گز ہر گز یہ ثابت نہیں ہوتی کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے افعال اس کے عدل اوراس کی قدسیت ورحمت ومحبت سے مطابقت وموافقت رکھتے ہیں۔ قرآن یہ بھی نہیں بتاتا کہ انسان کس طرح سے اپنے گناہوں کی معافی حاصل کرکے خدا کے حضور میں راستباز ٹھہر سکتا ہے۔ بیشک بعض قواعد وقوانین بتائے گئے ہیں جن کی تعمیل سے ثواب حاصل ہوسکتا ہے لیکن قرآن میں تقدیر وقسمت سے رہائی پانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور قسمت ہی ہر ایک فردِ بشر کی آئندہ سعادت وشقاوت کا فیصلہ کرتی ہے۔ قرآن میں کفارہ بھی ندارد ہے اور نہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ جو آدمی گناہ کا غلام ہو وہ گناہ کی زنجیروں کو کیونکر توڑے اور اس سے کیسے آزاد ہو۔

بعض مسلمان کہتے ہیں کہ قیامت کے روز حضرت محمد اپنی اُمت کی شفاعت کرینگے۔ بعض کا خیال ہے کہ اب بھی اگرچہ وہ مردہ ہیں اللہ تعالیٰ ان کی سنتاہے۔ لیکن یہ سب باتیں بائبل کی تعلیم کے بالکل خلاف ہیں جس کا مصدقِ

[1] یہ کتاب ۱۲۸۵ ہجری میں تمام ہوئی تھی۔

ہونے کا قرآن مدعی ہے۔ یوحنا ۱۴: ۶ اعمال الرسل ۴: ۱۲، ۱ تیمتھیس ۲: ۵، ۶ اورایسی ہی اور آیات سے صاف ظاہر ہے کہ سیدنا مسیح کے سوا کوئی دوسرا شفاعت کنندہ نہیں ہے۔ علاوہ برین قرآن میں ایسا ایک جملہ بھی نہیں جس سے اس خیال کی تائید ہو کہ حضرت محمد خدا وانسان کے درمیان شفیع ودرمیانی ہیں۔ اس مضمون پر احادیث کی بیانات کی کچھ وقعت نہیں کیونکہ جس کو قرآن میں اپنے گناہوں کی مغفرت ومعافی مانگنے کا حکم ہوتا ہے وہ خدا کے حضور میں کسی کی شفاعت کرنے کے لائق نہیں ہے۔ گنہگار آدمی جس نے توبہ کرلی ہو وہ اپنے اور دوسروں کے گناہوں کی مغفرت کے لئے دعا کرسکتا ہے لیکن یہ بالکل امرِ دیگر ہے۔ قرآن واحادیث دونوں حضرت محمد کو اپنے اوراپنی اُمت کے گناہوں کی مغفرت کے لئے دعا کرتا ہوا پیش کرتے ہیں۔ مبتلا سورۃ المومن کے چھٹے رکوع کی پانچویں آیت میں یوں مرقوم ہے فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ یعنی سوتو ٹھہرارہ بیشک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اوراپنے گناہوں کی مغفرت مانگ اور تسبیح کر اپنے رب کی صبح وشام۔ پھر اسی طرح سورۃ النسا کی ۱۰۵ ویں آیت میں مرقوم ہے وَاسْتَغْفِرِ اللّهِ یعنی اللہ سے مغفرت مانگ ۔ پھرایسی ہی اور آیات ہیں جن میں قرآن بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد کے گناہ بخشتا ہے ۔ مثلاً سورۃ الفتح کی پہلی اوردوسری آیت میں یوں مندرج ہے ۔ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًالِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ یعنی ہم نے فیصلہ کردیا تیرے واسطے صریح فیصلہ تا کہ معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہوئے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے۔ عباسی کہتا ہے کہ اس سے حضرت محمد کے وہ گناہ مراد ہیں جوانہوں نے نبوت کا دعویٰ کرنے سے پیشتر کئے تھے اور جو وہ مرنے تک کرنے والے تھے ۔ بیضاوی اور دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے وہ خطائیں مراد ہیں جو آنحضرت نے ایامِ جہالت میں اور ان آیات کے نزول تک کیں[1] ۔ یہ فرض کرکے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ان آیات میں حضرت محمد کا ہمیں نہایت صاف وبرہنہ بیان ملتا ہے۔ یہ ہر گز نہیں کہا جاسکتا کہ لفظ " ذنب" سے قرآن میں ایسی خفیف خطائیں مراد ہیں جن کو گناہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ سورۃ الرحمنٰ کی ۳۹ویں آیت میں یہی لفظ جن وانس کے گناہ کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ القصص کے آٹھویں رکوع کی تیسری آیت میں بت پرستوں کے گناہ لفظ" ذنب" سے تعبیر کئے گئے ہیں اوراس آیت میں ذنب " جرم" کا مترادف ہے ۔ سورہ یوسف کی ۲۹ویں آیت ۔ سورۃ الملک کی ۱۱ویں آیت اور سورۃ الشمس کی ۱۴ویں آیت اور دیگر آیات میں یہی لفظ تکذیب وبدگوئی اور شہوت پرستی وکفر اور دیگر بدترین جرائم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ سورہ محمد کی ۲۱ویں آیت میں حضرت محمد سے یوں خطاب کیا گیا ہے وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ یعنی اورمعافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے اور ایماندار مردوں اور عورتوں کے لئے۔ اس آیت میں حضرت محمد کا اپنا شخصی گناہ صاف طور سے ان سے منسوب کیا گیا ہے اور مومنین کے گناہوں سے جدا بیان کیا گیا ہے اگرچہ بعضوں نے بے فائدہ وبے سود لِذَنبِكَ پر یہ معنی چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس سے مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہ مراد ہیں۔ سورۃ الانشراح کی پہلی تین آیات میں خدا حضرت محمد سے یوں خطاب کرتا ہوا پیش کیا جاتا ہے کہ أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا

---

[1] الزمخشری کہتا ہے کہ ماتقدم سے زینب کے معاملہ کی طرف اشارہ ہے اور ماتاخر سے مصری مریم کی طرف۔

عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ یعنی کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا اس یعنی کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینا اور اتار رکھا ہم نے تجھ پر سے تیرا بوجھ جس نے تیری پیٹھ توڑدی؟ ان تمام آیات کے معانی میں غلط فہمی کرنا غیر ممکن ہے۔

خواہ ہم سنی مسلمانوں کی کتابوں کو دیکھیں خواہ شیعہ صاحبان کی کتابوں کو بہر دوحالت احادیث بھی اس امر میں قرآن کے ساتھ متفق ہیں ۔ ہم فقط تھوڑی سی مثال کے طور پر پیش کرینگے۔ احمد الترمذی اور ابن ماجہ حضرت فاطمہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت محمد مسجد میں داخل ہوتے تھے توکہا کرتے تھے " اے[1] خدا میرے گناہ معاف فرما اور میرے لئے اپنی رحمت کا دروازہ کھول" اورجب باہر نکلتے توکہتے تھے" اے خدا میرے گناہ معاف کر اور میرے لئے اپنے فضل کا دروازہ کھول" حضرت عائشہ سے آنحضرت کی ایک اور دعا مروی ہے جس میں اللھمہ اغفرلی[2] یعنی" اے خدا مجھے معاف کر" پایا جاتا ہے ۔ ایک اور مقام پر مسلم حضرت عائشہ سے روایت کرتا ہے کہ حضرت محمد یوں دعا کرتے تھے" اے[3] خدا میں تیری خفگی سے تیری خوشنودی میں اور تیرے عذاب سے تیری معافی میں پناہ لیتا ہوں" احمد الترمذی اور ابو داؤد حضرت علی کی روایت سے آنحضرت کی یہ دعا نقل کرتے ہیں کہ" یقیناً[4] میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔ اس لئے مجھے معاف کر کیونکہ

---

[1] مشکواۃ المصابیح صفحہ ٦٢

[2] مشکواۃ صفحہ ٧٤

[3] مشکواۃ صفحہ ٧٦

[4] مشکواۃ صفحہ ٢٠٦

تیرے سوا گناہ معاف کرنے والا اور کوئی نہیں ہے"۔ ابو موسیٰ کے بیان کے مطابق حضرت محمد یوں بھی دعا کیا کرتے تھے" اے[5] خدا میرے گناہ مجھے معاف فرما۔ میری نادانی اور کام میں تجاوز اورجوکچھ تومجھ سے بہتر جانتا ہے معاف کردے۔ اے خدا میرا جوش اور استہزا اور خطا اور ضد اور سب کچھ جو مجھ میں ہے مجھے معاف فرما ۔ اے خدا میرے پہلے اور پچھلے گناہ اورجوکچھ میں نے چھپایا اور ظاہر کیا معاف فرما"۔ علاوہ بریں دعواۃ الکبیرہ میں بیضاوی[6] حضرت عائشہ سے روایت کرتا ہے کہ ایک روز عائشہ نے حضرت محمد سے کہا " یا رسول اللہ کیا خدا کی رحمت کے بغیر کوئی بہشت میں داخل نہیں ہوسکتا"؟ اس کے جواب میں آنحضرت نے تین بار فرمایا" خدا کے رحم کے بغیر کوئی بہشت میں داخل نہیں ہوسکتا"۔ اس پر حضرت عائشہ نےکہا" یا رسول اللہ کیا آپ بھی نہیں داخل ہوسکتے"؟ حضرت محمد نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا" جب تک خدا اپنی رحمت سے میرے لئے پختہ فیصلہ نہ کردے میں بھی داخل نہیں ہوسکتا"۔ یہ بھی آنحضرت نے تین بار کہا۔

امام جعفر[7] بیان کرتے ہیں ۔ایک رات جب حضرت محمد ام سلمیٰ کے حجرہ میں نماز میں مشغول تھے رو کرکہنے لگے" اے خدا مجھ کو ہر گز بدی کی طرف واپس نہ لوٹا اگرچہ تونے مجھے اس سے چھڑایا ہے اور ایک لحظ بھر کے لئے بھی مجھے اپنی حالت پر مت چھوڑ"۔ ام سلمیٰ نےکہا "جب خدا نے آپ کے پہلے پچھلے سب گناہ معاف کردئے ہیں توپھر آپ کیوں ایسا کہتے اور روتے ہیں؟"

---

[5] مشکواۃ صفحہ ٢١٠ اسی قسم کی احادیث صفحہ ١٠٠ ، ١٠۴ پر مرقوم ہیں۔

[6] معقول اور مشکواۃ صفحہ ١٠٧ ۔

[7] حیات القلوب جلد دوم صفحہ ٧٥

آپ نے فرمایا "اے ام سلمیٰ میں کیونکر محفوظ ہوسکتا ہوں جبکہ اللہ تعالیٰ نے یونس کو جب ایک چشم زدن کے لئے اس کی حالت پر چھوڑ دیا تو اس نے کیا جو کیا"۔ پھر محمد باقر[1] سے روایت ہے کہ ایک رات حضرت محمد عائشہ کے کمرہ میں تھے اور بہت سی نماز پڑھ کر دعا کررہے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت عائشہ نے پوچھا" جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے ماضی واستقبال کے سب گناہ معاف کردئے ہیں توپھر آپ کیوں اس قدر تکلیف اٹھاتے ہیں ؟آنحضرت نے فرمایا" اے عائشہ! کیامیں خدا کا شکر گذار بندہ نہ بنوں"؟ پھر یہ بھی مرقوم ہے کہ ایک روز اپنے مومنین سے ایک تقریر کے بعد آنحضرت نے بار بار کہا" اے خدامجھے اور میرے لوگوں کو معاف کر" اور پھر کہا" میں اپنے لئے اور تمہارے لئے خدا سے مغفرت مانگتا ہوں"۔سنی وشیعہ ہر دوفریق کی کتابوں میں سے اس قسم کی اور بہت سی احادیث پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہی کافی ہیں۔

یہ سب بیانات حضرت محمد کو بہت اچھی صورت میں پیش کرتے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دیگر انبیا کی مانند جو محض انسان تھے آنحضرت نے بھی اپنے لئے خدا کی رحمت ومعافی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ قرآن عہدِ عتیق کے انبیاء اور دیگر لوگوں کے بعض گناہ بیان کرتا ہے مثلاً حضرت آدم[2]، حضرت نوح[3]، حضرت ابراہیم[4]، حضرت موسیٰ[5] اورہارون ۔ حضرت یوسف[6]، حضرت داؤد[7]، حضرت سلیمان[8]، حضرت یونس[9] کے ۔ بیشک جیسا کہ بائبل میں مرقوم ہے انہوں نے توبہ کی۔ مثلاً ۵۱ویں زبور میں حضرت داؤد کی توبہ کے اظہار میں اس کی نہایت مناسب وموزون دعا مرقوم ہے۔ ہر ایک گنہگار کو اس امر کی ضرورت ہے کہ توبہ کرکے خدا سے مغفرت ومعافی حاصل کرے اور معافی مانگنا اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ معافی مانگنے والا کسی جرم کا مجرم ہے اور اس لئے اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔ ہر ایک انسان جو محض انسان ہے حضرت محمد کی منقولہ بالادعاؤں کو استعمال کرکے فائدہ اٹھاسکتا ہے ۔ لیکن جوآدمی توبہ کا محتاج ہے یا کبھی تھا وہ دوسرے لوگوں کے گناہوں کا کفارہ نہیں دے سکتا ۔ لہذا قرآن یہ تعلیم دیتا[10] ہے کہ قیامت کے روز اس طریقہ سے کوئی بھی کسی دوسرے کی مدد نہیں کرسکیگا۔ پس چونکہ حضرت محمد اپنے امتیوں کو نہیں بچاسکتے ۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ ان کو کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو انہیں بچانے پر قادر ہو۔ قرآن کسی نجات دہندہ اور کفارہ کا پتہ نہیں بتاتا اوراس لئے انسان کی روحانی ضروریات کو پورا کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا ۔ سچے الہام الہیٰ کی پہچان کی جتنی شرائط تمہید میں معیار مقرر کی گئی تھیں ان میں سے کوئی بھی قرآن کے حق میں پوری نہیں ہوتی ۔ اس امر میں جیسا کہ ہم اس کتاب کے دوسرے حصہ میں روشن کرچکے ہیں قرآن وانجیل میں

---

[1] حیات القلوب جدل دوم صفحہ ۷۷

[2] سورۃ البقرہ آیت ۳۵۔ سورہ طہٰ آیت ۱۱۹

[3] سورہ نوح آیت ۲۹

[4] سورہ انعام آیت ۷۶ سے ۷۸ تک سورہ ابراہیم آیت ۴۲

[5] سورۃ الاعراف آیت ۱۵۰ ۔ سورۃ الشعرا آیت ۱۹ ۔ سورۃ القصص آیت ۱۴، ۱۵،

[6] سورہ یوسف آیت ۴۴

[7] سورہ ص آیت ۲۳، ۲۴۔

[8] سورہ ص آیت ۳۴،

[9] سورہ الصافات آیات ۱۳۹ سے ۱۴۴ تک۔

[10] سورۃ البقرہ آیت ۴۷، ۱۲۳ ، سورہ انعام آیت ۱۶۴ سورۃ الانفطار کی آخری آیت

زمین وآسمان کا فرق ہے ۔ سیدنا مسیح[1] زندہ ہے اور حضرت محمد مردہ ہیں۔ سیدنا مسیح نہ فقط کامل انسان اوربے گناہ ہے بلکہ کلمتہ اللہ ہے ۔ جواس[2] کے وسیلہ سے خدا کے پاس آتے ہیں وہ انہیں پوری پوری نجات دے سکتا ہے کیونکہ وہ ان کی شفاعت کے لئے ہمیشہ زندہ ہے۔

یہ بھی واضح ہو اور یاد رہے کہ اس کتاب میں شروع سے آخر تک ہر گز ہر گز مناظرہ ہمارا مقصود نہیں ہے بلکہ ہمارا مطلوب تحقیق وتلاش حق ہے۔ دینی معاملات میں تعصب وطرفداری سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا خدا کے فضل سے تعصب وطرفداری کو بالکل برطرف کرنا چاہیے۔ مضامین متن قرآن کے باب میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں ان اوراق کے مصنف کے نہ فقط خوش اخلاقی وتہذیب کو حتی الوسع ملحوظ رکھاہے بلکہ دیانتداری اور منصف مزاجی کے اصول کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور آئندہ ابواب میں جو کچھ بھی کہنے کو باقی ہے اس میں بھی انہیں اصول پر عمل کیا جائیگا۔

[1] سورۃ البقر آیت ۴۷، ۱۲۳ ۔ سورہ انعام آیت ۱۶۴ ۔ سورۃ الانفطار کی آخری آیت

[2] سب مسلمان جانتے ہیں کہ مدینہ میں اسی کی قبر خالی ہے نہ کہ حضرت محمد کی۔

# پانچواں باب

## جو معجزات حضرت محمد سے منسوب کئے جاتے ہیں ان کی اس غرض سے تحقیق کہ ان سے آنحضرت کے دعوایِ نبوت ورسالت کی کہاں تک تائید ہوتی ہے

کسی آدمی کو فی الحقیقت نبی ثابت کرنے کے لئے یہ ہر گز ضروری نہیں کہ اس کو صاحبِ معجزات بھی ثابت کیا جائے۔ بہت سے نبی معجزہ کی قدرت کے بغیر آئے اور برعکس اس کے بعض آدمیوں نے جو نبی ورسول ہو کر نہیں آئے تھے معجزہ نما کام کئے ہیں مثلاً حضرت موسیٰ کے ایام میں مصری جادو گروں نے ایسے کام کئے جو اس ملک کے مشرکوں کی نظر میں حضرت موسیٰ کے معجزات کی مانند تعجب خیزوحیرت انگیز تھے (خروج ۷: ۱۰، ۱۳، ۲۲، ۸: ۷، ۱۸)۔ علاوہ بریں ہم کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جھوٹے نبی معجزات دکھائینگے (مرقس ۱۳: ۲۲، متی ۲۴: ۲۴، مکاشفہ ۱۶: ۱۳، ۱۴، ۱۹: ۲۰)۔ خاص کروہ ایک جو ابھی آنے والا ہے جس کو مسلمان دجال کہتے ہیں ۔سچے نبیوں میں سے بہت ہی تھوڑوں نے معجزات دکھائے ہیں۔ عہدِ عتیق میں حضرت موسیٰ سے پیشتر کسی نبی کا کوئی معجزہ مذکور نہیں ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰ نہ فقط ایک بڑا نبی تھا بلکہ وہ ایک نیا الہام لانے والا تھا اس لئے اسے چند معجزات کی قدرت عنایت ہوئی جن کا توریت میں ذکر پایا جاتا ہے ۔ اس کے خدا کی طرف سے نئے الہام کے ساتھ آنے اور خدا کی طرف سے کلام

کرنے کے ثبوت میں ان معجزات کی ضرورت تھی ۔ ایلیاہ اور الیشع کو بھی قدرت عطا کی گئی کیونکہ وہ ایسے زمانہ میں تھے جبکہ دین حق قریباً معدوم تھا اور ان کا کام تھا کہ لوگوں کو پھر خدا کی طرف واپس بلائیں۔ لیکن ہم کو کہیں سے بھی آگاہی نہیں ملتی کہ حضرت داؤد یرمیاہ اور دیگر بڑے بڑے انبیا کو معجزات کی قدرت ملی۔ یوحنا بپتسمہ دینے والا (یحییٰ) جو کہ اپنے سے پہلے تمام انبیاء سے بڑا تھا( متی ۱۱: ۱۱، لوقا ۷: ۲۸)۔ اس کے حق میں یہودیوں نے بظاہر سچ کہا تھا کہ " یوحنا نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا"(یوحنا ۱۰: ۴۱)لہذا صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فقط نازک موقعوں پر یا نئے الہام کے ساتھ انبیاء عظام کو ان کی الہیٰ نبوت ورسالت کے ثبوت پر معجزات کی قدرت بخشی۔

لیکن اگر حضرت محمد کے دعوے با بنیاد تھے تو آنحضرت خاتم النبین تھے اور تمام انبیاء میں سے بزرگ گرین اوراہل عرب کی طرف مبعوث تھے جن کی طرف پہلے کوئی نبی نہیں بھیجا گیا تھا۔ آنحضرت نے دعویٰ کیا کہ آپ پر بے نظیر وحی الہیٰ نازل ہوا جو پیشتر کے تمام وحی والہامات سے اعلیٰ وافضل تھا اور جو قرآن آپ پڑھ کر سناتے تھے وہ آپ کو جبرائیل فرشتہ نے سکھایا تھا ۔ جب وہ شبِ قدر میں فلک الافلاک سے لایا جہاں خدا کے حکم سے لوح محفوظ پر مرقوم تھا۔ علاوہ بریں حضرت محمد نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ آپ کا پیغام تمام بنی آدم کے لئے ہے اوراس کے بعد وحی والہام کادروازہ بند ہے۔ لہذا اس عظیم الشان دعویٰ کی تائید کے لئے ضروری تھا کہ آنحضرت معجزات دکھاتے اور ورنہ آپ کا دعویٰ سچا نہیں ہوسکتا کیونکہ (جیسا کہ بیان ہوچکا ہے ) آنحضرت نے کوئی پیشین گوئی نہیں کی تھی۔ لہذا ہم دریافت کرتے ہیں کہ آنحضرت نے کونسے معجزات دکھائے ؟

اس معاملہ میں قرآن ہم کو یہ صاف وصریح جواب دیتا ہے کہ آنحضرت نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ یہ جواب قرآن کی بہت سی آیات سے اظہر من الشمس ہے۔ ان میں جو سب سے زیادہ صاف وصریح ہیں ان میں سے ایک سورہ بنی اسرائیل کی ۶۱ ویں آیت ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے وَمَا مَنَعَنَا أَن نُّرْسِلَ بِالآيَاتِ إِلاَّ أَن كَذَّبَ بِهَا الأَوَّلُونَ یعنی اورہم نے اسی سے نشانیاں بھیجنا موقوف کیا کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔ بیضاوی[1] اس آیت کی تفسیر میں یوں لکھتا ہے " ہم کو کسی چیز نے وہ نشان بھیجنے سے جو قریش نے طلب کئے باز نہیں رکھا سوا اس حقیقت کے کہ عاد وثمود جیسی قدیم اقوام نے ان کی تکذیب کی اور یقیناً اگر وہ نشان بھیج دئے جاتے تو قریش بھی ضرور ان کی تکذیب کرتے کیونکہ وہ عاد وثمود کا سا مزاج رکھتے ہیں اوراس طرح ان کی بیخکنی لازم ٹھہرتی کیونکہ ہمارا قاعدہ یہی ہے اورہم نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ ہم ان کی بیخکنی نہیں کرینگے کیونکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ایمان لائینگے یا ان کی اولاد ایسی ہوگی جو ایمان لائیگی ۔ عباسی بھی اس آیت کا مطلب بہت کچھ ایسا ہی بیان کرتا ہے۔ بیشک اس آیت کا مطلب بالکل صاف وواضح ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد کو قریش کے طلب کردہ معجزات دکھانے کی قدرت نہیں دی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ قریش کے لوگ آنحضرت کو نبی نہیں مانینگے اگرچہ آپ کے دعوے کے ثبوت میں معجزات بھی ساتھ ہوں۔

علاوہ بریں اور ایسی آیات موجو دہیں جن میں یہی مضمون ذرا کم وضاحت کے ساتھ پایا جاتا ہے ۔ مثلاً سورۃ البقرہ کی ۱۱۸ ویں اور ۱۱۹ ویں

[1] جلد اول صفحہ ۵۴۳

آیت میں یوں مرقوم ہے وَقَالَ الَّذِينَ لاَ يَعْلَمُونَ لَوْلاَ يُكَلِّمُنَا اللّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا یعنی اور کہنے لگے جن کو علم نہیں کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ ؟ یا ہم کو آوے کوئی نشانی ۔ اسی طرح کہہ چکے ہیں ان سے اگلے انہیں کی سی بات ۔ ان کے دل بھی ایک سے ہیں۔ ہم نے بیان کردی نشانیاں ان لوگوں کو جن کو یقین ہے ۔ ہم نے تجھ کو بھیجا ٹھیک بات لے کر خوشی اور ڈرسنانے کو۔ اس عبارت کے متعلق بیضاوی[1] لکھتا ہے کہ قریش کو اطمینان حاصل نہیں ہوا تھا کیونکہ ان کے پاس نشانیاں نہیں پہنچتی تھیں۔ جو نشانیاں انھوں نے طلب کی تھیں ان کی جگہ ۱۱۸ ویں آیت کے آخری حصہ میں ان کو آیات قرآنی حضرت محمد کی نبوت ورسالت کے ثبوت میں بتائی گئی ہیں۔ یہ نشانیاں یعنی الایت جو ۱۱۸ ویں آیت کے آخری حصہ میں مذکور ہیں قرآنی آیتیں ہیں۔ ان سے معجزات مراد نہیں لے جاسکتے کیونکہ سورۃ البقر کی ۱۵۲ ویں آیت میں یوں مرقوم ہے كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا یعنی جیسا بھیجا ہم نے تم کو رسول تم ہی میں کا پڑھتا تمہارے پاس آیتیں[2] ہماری۔ اور فعل یتلوا کے معنی معجزہ کے لئے بالکل نامناسب ہیں۔ پھر ایسا ہی ۲۵۳ ویں آیت میں مندرج ہے تِلْكَ آيَاتُ اللّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ یعنی یہ آیتیں ہیں اللہ کی ۔ ہم تجھ کو سناتے ہیں

[1] جلد اول صفحہ ۸۱

[2] دیکھو سورۃ العنکبوت کی ۵۰ ویں آیت۔

تحقیق اور تو بےشک رسولوں میں سے ہے اور ۹۸ ویں آیت میں مرقوم ہے وَلَقَدْ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلاَّ الْفَاسِقُونَ یعنی اور ہم نے اتاری تیری طرف آیتیں واضح اور منکر نہ ہونگے ان سے مگر وہی جو بے حکم ہیں۔ فعل انزلنا سے صاف ظاہر ہے کہ ایت بینت سے قرآنی آیتیں یعنی عبارت قرآن ہی مراد ہے جس کے لئے ہمیشہ یہی فعل استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے سورۃ الاعراف کی ۲۰۳ آیت میں لفظ ایۃ کا مفہوم صاف طور سے عبارت قرآنی ہے۔ پھر سورۃ انعام کی ۱۲۴ ویں آیت میں یوں مرقوم ہے وَإِذَا جَاءتْهُمْ آيَةٌ قَالُواْ لَن نُّؤْمِنَ حَتَّى نُؤْتَى مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللّهِ یعنی اور جب پہنچی ان کو ایک آیت کہتے ہیں ہم ہرگز نہ مانینگے جب تک ہم کو نہ ملے جیسا کچھ پاتے ہیں اللہ کے رسول ۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قریش نے آیات عبارت قرآنی کی جگہ ایسے معجزات طلب کئے جن کے ساتھ بعض نبی آچکے تھے۔ سورہ انعام کی ۳۷ ویں آیت سے اور زیادہ صفائی کے ساتھ ۱۰۹ ویں آیت سے اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے وَأَقْسَمُواْ بِاللّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن جَاءتْهُمْ آيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ إِنَّمَا الآيَاتُ عِندَ اللّهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءتْ لاَ يُؤْمِنُونَ یعنی اور قسم کھاتے ہیں اللہ کی تاکید سے کہ اگر ان کو ایک نشانی پہنچے تو البتہ اس کو مانینگے ۔ توکہہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور تم مسلمان کیا خبر رکھتے ہو کہ جب وہ آئینگی تووہ نہ مانینگے؟ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت محمد کو معجزات دکھانے کی قدرت نہیں دی گئی تھی۔ جس قسم کا نشان قریش نے طلب کیا تھا اس کا بیان سورۃ الرعد کی ۳۰ ویں آیت میں نہایت صاف طور سے مندرج ہے ۔ چنانچہ مرقوم ہے وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ

الأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَى بَل لِّلّهِ الأَمْرُ جَمِيعًا یعنی اور اگر کوئی قرآن ہوا ہوتا کہ چلے اس سے پہاڑ یا ٹکڑے ہو اس سے زمین یا بولے اس سے مردہ (توکہہ) بلکہ اللہ کے ہاتھوں میں ہے سب کام۔ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں شرح وبسط ک ساتھ بیان کرتا ہے کہ اس موقع پر قریش نے حضرت محمد سے کیا طلب کیا تھا۔ پھر سورہ بنی اسرائیل کی ۹۲ویں آیت سے ۹۵ویں آیت اسی قسم کا بیان مندرج ہے چنانچہ مرقوم ہے وَقَالُواْ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الأَرْضِ يَنبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الأَنْهَارَ خِلالَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاء كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللّهِ وَالْمَلآئِكَةِ قَبِيلاً أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَى فِي السَّمَاء وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إَلاَّ بَشَرًا رَّسُولاً یعنی اور بولے ہم نہ مانینگے تیرا کہا جب تک تو بہا نہیں نکالتا ہمارے واسطے زمین سے ایک چشمہ۔ یا ہوجائے تیرے لئے ایک باغ کھجور اور انگور کا۔ پھر چلاے تو اس کے بیچ میں نہریں یا گرادے آسمان ہم پر جیسا کہا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے یا لے آ اللہ کو اور فرشتوں کو ضامن۔ یا ہووے تیرے لئے ایک ستھرا گھر۔ یا چڑھ جائے تو آسمان پر اور ہم یقین نہ کرینگے تیرے چڑھنے کا جب تک ہم پر کتاب نازل نہ کرے جس کو ہم پڑھیں۔ توکہہ سبحان اللہ میں کون ہوں مگر ایک آدمی ہوں بھیجا ہوا۔ ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت محمد کی رسالت کے ثبوت میں قرآن کے بے نظیر ہونے کے دعویٰ سے[1] قریش کی تسلی نہیں ہوئی تھی لہذا انہوں نے مذکورہ بالا قسم کا معجزہ طلب کیا تھا۔ اس کے جواب میں حضرت محمد کو یہ کہنے کا حکم ملا چونکہ آپ محض انسان تھے اس لئے ان کا طلب کردہ معجزہ نہیں دکھاسکتے تھے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ معراج اور بعض احادیث کے مطابق زمین بلکہ انگلیوں سے پانی جاری کرنے کے بیانات جو حضرت محمد کے حق میں کئے جاتے ہیں قابلِ اعتماد نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ بیانات سچے ہیں تو جو جواب مندرجہ بالاآیات میں قریش کو معجزہ طلب کرنے پر دیا گیا ہے اس کی کچھ ضرورت نہ تھی بلکہ حضرت محمد ضرور ایسے معجزات دکھانے کی قدرت وقابلیت کا دعویٰ کرتے ۔ پھر سورۃ العنکبوت کی ۴۹ویں اور ۵۰ویں آیت میں وہی معجزات کا مطالبہ اور وہی آیاتِ قرآنی کے سوا معجزہ دکھانے سے انکار مندرج ہے۔ وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَى عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَى لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ یعنی اورکہتے ہیں اس پر اس کے رب سے نشانیاں کیوں نہ اتریں؟ توکہہ نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں اور میں توفقط کھول کر سنانے والا ہوں۔ کیا ان کو یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔بیشک اس میں مہر ہے اور سمجھانا ان لوگوں کو جو مانتے ہیں۔

ان عباراتِ قرآنی سے اظہر من الشمس ہے کہ حضرت محمد معجزات دکھانے کی قدرت وقابلیت نہیں رکھتے تھے اور آنحضرت کی نبوت ورسالت کے دعویٰ کی صداقت کے ثبوت میں آیاتِ متن قرآن ہی پیش کی گئی ہیں۔

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل دسواں رکوع چوتھی آیت۔

اس سے پیشتر ہم ایک[1] باب میں اس امر کو محقق ومبرہن کرچکے ہیں کہ کسی کتاب کے طرز بیان کی فصاحت وبلاغت ہی اس کو اللہ تعالیٰ کی الہامی کتاب ثابت نہیں کرسکتی۔

بعض مسلمان کہتے ہیں کہ متنِ قرآن میں حضرت محمد کے دو معجزوں کا صاف ذکر موجود ہے۔ ان میں سے ایک معجزہ شق القمر بیان کیا جاتا ہے بیشک سورۃ القمر کی پہلی آیت میں یوں مرقوم ہے اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانشَقَّ الْقَمَرُ یعنی قریب آگئی وہ ساعت اور پھٹ گیا چاند۔ لیکن بہت سی وجوہ ہیں جن کے سبب سے اس آیت سے ہر گز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت محمد نے کوئی معجزہ دکھایا (۱) اگراس آیت کے معنی حضرت محمد کے معجزہ کے ہیں تو یہ آیت سورہ بنی اسرائیل ۶۱ ویں آیت کی متناقض ٹھہرتی ہے اور مسلمان کہتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی میں باہمی تناقض نہیں ہے۔ (۲) اس آیت میں شق القمر کے ساتھ حضرت محمد کا ذکر نہیں ہے اور سورۃ القمر یا کسی اور سورۃ میں کہیں بھی مرقوم نہیں کہ شق القمر سے آنحضرت کا کچھ علاقہ تھا۔ نہ قرآن شق القمر کو معجزہ کہتا ہے اور نہ حضرت محمد کی نبوت ورسالت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر قرآن کا مقصد اس امر کا اظہار ہوتا کہ حضرت محمد نے ایسا عظیم الشان وحیرت افزا معجزہ دکھایا تو ضرور اس کا صاف طور سے ذکر کرتا جیسا کہ عہد عتیق وجدید میں حضرت موسیٰ وسیدنا مسیح اوراس کے رسولوں کے بعض معجزات کاصاف بیاں مندرج ہے(۳) اگر فی الحقیقت حضرت محمد نے چاند کے دوٹکڑے کردئے ہوتے تو جب قریش نے معجزے طلب کئے تھے (سورۃ الرعد آیت ۳۰۔ سورہ بنی اسرائیل آیات ۹۲ سے ۹۵ تک )قرآن ان کے جواب میں ضرور اس کا ذکر کرتا کیونکہ مفسرین بالاتفاق سورۃ القمر کو سورۃ الرعد سورہ بنی اسرائیل سے پیشتر کی نازل شدہ قرار دیتے ہیں (۴) چاند جیسے مخلوق الہٰی کو نقصان پہنچانا بڑی قدرت کا اظہار کرتا ہے لیکن جو آدمی ایسا کرے وہ من جانب اللہ ورسول اللہ ثابت نہیں ہوتا(۵) اگر ایسا حادثہ وقوع میں آتا تو تمام رویِ زمین پر محسوس ہوتا اور بہت سی اقوام کی تواریخ میں ایک نادرواقعہ کے طور پر لکھا جاتا۔ جولوگ علم نجوم سے چاند کی جسامت کو جانتے ہیں اور جن کو یہ معلوم ہے کہ اگرچاند کے دوٹکڑے ہو کر ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ پر ہوجاتے توزمین پراس کی کیا تاثیر ہوتی وہ ہر گز یہ دعویٰ نہیں کرینگے کہ شق القمر واقعی وقوع میں آیا۔ (۶) علاوہ بریں کسی تواریخ میں ایسے واقع کا ذکر نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ چاند کا دوٹکڑوں میں کبھی دیکھا جانا بھی مذکور نہیں ہے ۔اور بعض بڑے بڑے مشہور مسلمان مفسرین کہتے ہیں کہ سورۃ القمر میں کسی ایسے وقوعہ کی طرف مطلق اشارہ نہیں ہے ۔ بیضاوی[2] سورۃ القمر کی پہلی آیت کی تفسیر میں اس خیال کو ترجیح دیتا ہے کہ فی الحقیقت چاند کے دوٹکڑے ہوگئے تھے کیونکہ وقد الشق[3] القمر کی قرات سے ایسا ہی ترجمہ ہوتا ہے (لیکن یہ قرات موجودہ قرآن کی قرات سے مختلف ہے)۔مگر بیضاوی بتاتاہے کہ " اس آیت کا مطلب یہ بیان کیا جاتاہے کہ قیامت کے روز چاند پھٹ جائیگا" اگر شق القمر فی الحقیقت وقوع

---

[1] تیسرا حصہ اور تیسرا باب

[2] جلد دوم صفحہ ۲۹۲

[3] زمخشری بتاتاہے کہ یہ حذیقہ کی قرات ہے ۔وہ اس آیت کا مطلب یوں بیان کرتاہے کہ " قیامت نزدیک آگئی ہے اور اسکے آنے کی نشانیوں میں سے ایک آبھی پہنچی ہے یعنی چاند کے دوٹکڑے ہوچکے ہیں۔

میں آیا ہوتا اور وہ حدیث[1] سچی ہوتی جس میں مرقوم ہے کہ حضرت نے اہلِ مکہ کو چاند دو ٹکڑوں میں دکھایا ایسا کہ کوہِ حرا دونوں ٹکڑوں کے بیچ میں دکھائی دے گیا یا جیسا کہ ایک دوسری حدیث[2] میں مندرج ہے ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر دکھائی دیا اور دوسرا نیچے تو اس امر میں کسی طرح کا شک وشبہ نہ ہوتا۔ مشکواۃ کے حاشیہ پر اس مشکل کو دور کرنیکی کوشش کی گئی ہے جو اس حقیقت سے پیدا ہوتی ہے کہ یہ عجیب نظارہ دنیا میں عام طور پر نہیں آیا۔ حاشیہ نویس کہتا ہے کہ یہ وقوعہ رات کے وقت کا ہے جبکہ سب لوگ سورہے تھے اور یہ ایک لمحہ کے لئے تھا اوراس لئے تمام دنیا میں اس کا دیکھا جانا ضروری نہ تھا۔(۷) لفظ الساعۃ جو کہ ال کے ساتھ ہے قرآن[3] واحادیث[4] دونوں میں اس کے خاص معنی ہیں ۔دونوں میں اس سے ہمیشہ قیامت مراد ہے جیسا کہ بیضاوی تسلیم کرتا ہے۔ اب صاف ظاہر ہے کہ سورۃ القمر کی تحریر کے وقت روز قیامت قریب نہیں تھا کیونکہ یہ سورۃ ہجرت سے بہت عرصہ پیشتر لکھوائی گئی تھی۔ لہذا چونکہ اس آیت میں چاند کا پھٹنا قرب قیامت سے متعلق ہے اس لئے اس کے معنی یہ ہیں کہ جب قیامت کا وقت قریب آئیگا تو چاند پھٹ جائے گا ۔ پس دونوں فعل جو اس آیت میں صیغہ ماضی میں ہیں مستقبل کے معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں اور یہ عربی زبان میں عام محاورہ ہے ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بیضاوی کے ایام میں بھی لوگ اس آیت کا ایسا مطلب بیان کرتے تھے اور ہم جو اتنا زمانہ بعد میں اب زندہ

[1] ازانس مشکواۃ صفحہ ۵۱۶

[2] ازا بن مسعود

[3] دیکھو سورہ طہٰ حج اور شوریٰ وغیرہ

[4] دیکھو مشکواۃ صفحات ۴۶۴ سے ۴۶۹ تک وغیرہ وغیرہ

ہیں خوب سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قرب قیامت کی علامت ان ایام میں ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ لہذا اعباسی خوب کہتا ہے کہ چاند کا پھٹنا اور دجال کا ظاہر ہونا جب وقوع میں آجائیں قریب قیامت کی علامتیں ہیں۔

پس مذکورہ بالاوجوہ سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مطلق یہ نہیں کہتا کہ حضرت محمد نے شق القمر کا معجزہ دکھایا۔

لہذا یہ آیت آنحضرت کے ایسا معجزہ دکھانے کے ثبوت میں پیش نہیں کی جاسکتی اور وہ معجزانہ واقعہ جواب تک وقوع میں بھی نہیں آیا حضرت[5] محمد کی نبوت ورسالت کے ثبوت میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت محمد کا دوسرا معجزہ جو بعض خیال کرتے ہیں کہ قرآن میں مذکور ہے وہ بعض کے نزدیک وہ واقعہ ہے جو جنگ بدر میں وقوع میں آیا اور بعض کی رای کے مطابق جنگِ حنین یا جنگِ اُحد میں یا جنگِ خیبر میں ۔کہا جاتا ہے کہ یہ معجزہ سورۃ الانفال کی ۱۷ ویں آیت کے اس فقرہ میں مذکور ہے وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـٰكِنَّ اللّٰهَ رَمَىٰ یعنی اور تونے نہیں پھینکا جس وقت پھینکا لیکن اللہ نے پھینکا۔ بیضاوی[6] لکھتا ہے کہ جنگِ بدر میں حضرت جبرائیل نے حضرت محمد سے کہا کہ ایک مٹھی خاک قریش پر پھینکیں۔ جب لڑائی ہورہی تھی آنحضرت نے سنگریزوں کی ایک مٹھی پھینکی اور فرمایا "

[5] سبع معلقات کے بعض عربی نسخوں میں امرالقیس کی ایک نظم میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں رنت الساعۃ والشق القمر جو معانی میں سورۃ القمر کی پہلی آیت سے کامل مطابقت وموافقت رکھتے ہیں۔ چونکہ امرالقیس قریباً ۵۴۰ء میں حضرت محمد کی ولادت سے بہت عرصہ پیشتر وفات پاچکا تھا اس لئے صاف ظاہر ہے کہ اس نے قرآن سے اقتباس نہیں کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ نظم فی الحقیقت امرالقیس کی نہیں ہے لیکن بہت سے علما اس کے بارے میں حیران وغلطان وپیچان ہیں۔

[6] جلد اول صفحہ ۳۶۲

شاهت الوجوه" یعنی چہرے بدصورت ہوجائیں۔ ان کی آنکھیں سنگریزوں سے بھر گئیں اور بھاگ نکلے اور مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا۔ جب بعد میں مسلمان اپنی فتحمندی اور دشمنوں کے مقتولوں کی کثیر تعداد پر فخر کرنے لگے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ بیضاوی کہتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں" اور تونے نہیں پھینکا (اے محمد جو تو ان کی آنکھوں میں ڈالنا چاہتا تھا اور تجھ سے نہیں ہوسکتا تھا) جب تونے پھینکا (یعنی جب تو بظاہر پھینکنے والا نظر آتا تھا) بلکہ خدا نے پھینکا (پھینکنے کی غرض کو پورا کیا اوران سب کی آنکھوں تک پہنچایا)"۔ لیکن بیضاوی اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے " اس کے معنی یہ بھی بیان کئے جاتے ہیں کہ جب تونے سنگریزے پھینکے تو تونے نہیں بلکہ " اللہ نے ان کےدلوں میں خوف ڈال دیا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں اس نیزہ کی طرف اشارہ ہے جس سے آنحضرت نے جنگ اُحد میں اُبے ابن خلف کو چھیدا اوراس سے خون بالکل نہ نکلا اور وہ کمزور ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ آخر مر گیا۔ یا اس تیر کی طرف اشارہ ہے جو آنحضرت نے جنگ خیبر میں قلعہ کے پاس چلایا جو کنانہ [1] ابن ابی الحقیق کو اس کے گھوڑے پر جا کر لگا۔ کثرت الرای پہلے معنوں کے حق میں ہے"۔ اس تفسیر سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ آیت زیر بحث کا جنگ بدر سے منسوب ہونا یقینی امر نہیں ہے۔ دراصل ممکن ہے کہ اس کا اشارہ اُحد یا خیبر کی طرف ہو۔ ایک مٹھی سنگریزوں کی طرف نہ ہو جو حضرت محمد نے پھینکی بلکہ تیر یا نیزہ کی طرف ہو۔ لیکن کسی حالت میں بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مذکورہ بالا موقعوں میں سے کسی موقع پر حضرت سے معجزہ ہوا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر قرآنی آیت یہ کہتی ہے کہ حضرت محمد اپنے دشمنوں کی آنکھوں میں سنگریزڈالنے یا ابے یا کنانہ کو قتل کرنے میں بھی خود بخود کامیاب نہ ہوئے کیونکہ فاعل حضرت محمد نہیں بلکہ خدا بیان کیا گیا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ اس آیت میں جنگ بدر ہی کی طرف اشارہ ہے تو ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سپہ سالار کے لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ وہ اپنے سپاہیوں کی ہمت افزائی اوراپنے دشمنوں کی پریشانی کے لئے کوئی ایسا کام کرے جیسا حضرت محمد نے کیا۔ پھر اگر نتیجہ فتح مندی ہو تو کسی کے وہم میں بھی نہیں گذریگا کہ وہ فعل فوق العادت یا معجزہ نہ تھا اور اگر ہم دوسری احادیث کو صحیح اور سچی تسلیم کریں تو کسی آدمی کا تیر چلانا یا نیزہ سے دشمن کو چھید نا معجزانہ نہیں سمجھا جاتا۔

ان آیات کے علاوہ بعض مسلمان خیال کرتے ہیں کہ ایتٍ بینتٍ کے الفاظ جو قرآن کی اور آیات میں پائے جاتے ہیں ان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمد نے فی الحقیقت معجزات دکھائے۔ اگر یہ سچ ہے تو نہایت عجیب بات ہے کہ کسی ایسی آیت میں کسی معجزے کا بیان پایا نہیں جاتا اور نہ کسی معجزہ سے متعلقہ امور ہی کہیں مندرج ہیں۔ برعکس اس کے جب قرآن مسیح کے معجزات کا ذکر کرتا ہے تو ان میں بعض کے باب میں صاف بتاتا ہے کہ وہ کیا تھے (سورہ آل عمران آیت ۴۸)۔ لیکن ہم ایسی چند آیات پر غور کرینگے جن میں ایتٍ بینتٍ کا مفہوم معجزات بیان کیا جاتا ہے۔

اول سورۃ الصف کی چھٹی آیت ہے۔ اس میں یوں مرقوم ہے جَاءهُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ یعنی پھر جب آیا پاس ان کے کھلی نشانیاں لے کر بولے یہ جادو ہے صریح۔ اس آیت میں اس کا اشارہ اس شخص کی طرف

[1] صفیہ کا شوہر۔ اس کے چند ہی روز بعد آنحضرت نے صفیہ سے نکاح کرلیا۔

ہوسکتا ہے جس کو احمد [1] کے نام سے نامزد کیا گیا ہے اور جس کی آمد کا اسی آیت میں وعدہ کیا گیا ہے یا ممکن ہے اس سے عیسیٰ ہی مراد ہو جس کا ذکر اس آیت کے پہلے حصہ میں ہے۔ بیضاوی دوسرے خیال کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ وہ اپنی تفسیر [2] میں یوں کہتا ہے " اس چیز کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ وہ آیا تھا اور اس کو جادو کہنا مبالغہ کی راہ سے ہے اور حمزہ و کسائی کی قرات کے لحاظ سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے" ۔ یہ جادو گر ہے" کا اشارہ عیسیٰ کی طرف ہے "۔ اگر اس مفسر کی تفسیر درست ہے تو اس آیت سے حضرت محمد کے معجزات کے حق میں کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا ورنہ اس آیت میں اور قرآن کی دیگر عبارات میں جیسا کہ ہم پہلے واضح کرچکے ہیں آیاتِ عباراتِ قرآنی ہی بار بار ایتٍ بینتٍ اور ایتٍ کہلاتی ہیں۔

اگر کوئی یوں کہے کہ سورۃ الصف کی چھٹی آیت میں جادو کے ذکر ہی سے صاف ثابت ہوتا کہ ضرور کوئی فوق العادت کام کیا گیا تھا کیونکہ قرآنی عبارت کی فصیح و بلیغ آیات کے لئے لفظ جادو استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا تو اس کا جواب قرآن ہی سے فوراً دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً سورہ ص کی چوتھی آیت میں یوں مرقوم ہے وَعَجِبُوا أَن جَاءهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ یعنی تعجب کیا انہوں نے اس پر کہ آیا ان کے پاس ڈر سنانے والا انہیں میں سے اور کافروں نے کہا یہ جھوٹا جادو گر ہے۔ سورۃ الزخرف کی ۲۹ویں آیت میں یوں مندرج ہے وَلَمَّا جَاءهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ یعنی جب حق ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا یہ جادو ہے اور ہم اس کو نہیں مانینگے اس کے بارے میں بیضاوی [3] کہتا ہے کہ " انہوں نے قرآن کا نام جادو رکھدیا تھا "۔ پھر سورۃ الاحقاف کی چھٹی آیت میں مرقوم ہے وَإِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءهُمْ هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ یعنی اور جب ہماری کھلی باتیں ان پر پڑھی جاتی ہیں تو منکر سچی بات کو جب ان تک پہنچتی ہے کہتے ہیں یہ صریح جادو ہے۔ اس آیت کے الفاظ سورۃ الصف کی چھٹی آیت کے الفاظ سے مطابقت رکھتے ہیں اور علاوہ بریں جیسا آیاتِ قرآنی سے مطلب صاف ظاہر ہے ویسا ہی بیضاوی [4] نے بھی حقیقت ظاہر کردی ہے۔

بہت سے مسلمان کہتے ہیں کہ احادیث میں حضرت محمد کے بہت سے عجیب وغریب معجزات کا بیان مندرج ہے۔ بیشک یہ سچ ہے لیکن اس سے پیشتر کہ ہم ایسے معجزات کے حق میں احادیث کی شہادت کو قبول کریں ضرور ہے کہ احادیث کے معتبر اور قابلِ اعتماد ہونے کے معاملہ پر بھی غور کریں۔ اول تو ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نہ فقط حضرت محمد کے کسی معجزے کا ذکر ہی نہیں کرتا بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو معجزات کی قدرت کیوں نہیں دی تھی۔ ذی ہوش صاحبِ علم کے نزدیک خواہ وہ مسلمان ہو خواہ مسیحی قرآن کی یہ شہادت احادیث کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترجیح کے لائق ہے۔ علاوہ بریں یہ سمجھنا آسان ہے کہ بعد میں ایسی احادیث جن میں حضرت

---

[1] انجیل میں ایسا کوئی وعدہ مرقوم نہیں۔

[2] جلد دوم صفحہ ۳۳۰

[3] جلد دوم صفحہ ۳۳۸

[4] جلد دوم صفحہ ۲۵۴

محمد کے معجزات مذکور ہیں کس طرح پیدا ہو گئیں لیکن برعکس اس کے یہ خیال کرنا غیر ممکن ہے کہ یہ قرآنی آیات آنحضرت کے معجزات کی نفی کی غرض سے بعد میں بنا کر داخلِ قرآن کی گئیں۔ دوم جنہوں نے احادیث کو جمع کیا ان کو واقعاتِ مندرجہ احادیث کا خود کچھ علم نہ تھا۔ وہ حضرت محمد کے ایام سے سینکڑوں سال بعد ہوئے اوران کے علم احادیث کادارومدار ان باتوں پر تھا جوانہوں نے لوگوں سے زبانی سنیں اور خیال کیا کہ ان پر معتبر شہادت بہم پہنچ سکتی ہے۔ احادیث مندرجہ صحاح الستہ کے مولفین کی وفات[1] کی تاریخیں حسب ذیل ہیں:

بخاری نے ۲۵۶ ہجری میں ۔ مسلم نے ۲۶۱ ہجری میں۔ ترمذی نے ۲۷۹ ہجری میں ۔ ابوداؤد نے ۲۷۵ ہجری میں۔ النسائی نے ۳۰۳ ہجری میں ابن ماجہ نے ۲۷۳ ہجری میں وفات پائی۔ شیعہ صاحبان کی کُتب احادیث اور بھی بعد کی ہیں مثلاً کافی مولفہ ابوجعفر محمد ۳۲۹ ہجرمیں تالیف ہوئی ۔ شیخ علی کی من لایستحضر الفقیہ ۳۸۱ ہجری میں۔ تہذیب مولفہ شیخ ابوجعفر ۴۶۶ ہجری میں۔ استبصار ۴۰۶ ہجری میں اور نہج البلاغۃ مولفہ سید رضی ۴۰۶ ہجری میں۔ یہ حقیقت کہ سنی وشیعہ اگرچہ ایک ہی قرآن کو ماننے والے ہیں تو بھی احادیث کے کسی ایک مجموعہ کے باب میں متفق نہیں ہوسکتے صاف ظاہر کرتی ہے کہ احادیث جب قرآن کی ضدو نقیض ہوں تو بہت ہی ناقابلِ اعتماد ہیں۔ غالباً سب سے زیادہ معتبر اورقابلِ اعتماد صحیح بخاری کی احادیث ہیں۔ پھر ان کے بعد مسلم اور ترمذی کی ۔ لیکن معزز ناظرین کو یہ دکھانے کی غرض سے کہ

[1] کشف الظنون جلد دوم صفحات ۳۴ سے ۳۷ تک

بخاری کے ایام میں بھی کس قدر کثیر التعداد غیر معتبر احادیث رائج تھیں اوران ایام میں کس قدر سریع الاعتقادی اور لغویات کا رواج تھا بخاری کا اپنا بیان سنانا کافی ہوگا۔ بخاری بیان کرتا ہے کہ اس نے ایک لاکھ احادیث جمع کیں جن کا صحیح ہونا اس نے ممکن سمجھا اور وہ دولاکھ غیر معتبر احادیث جمع کیں۔ اس تین لاکھ کے مجموعہ میں سے آخر کار اس نے فقط ۷۲۷۵ کو معتبر سمجھا اورجب مکرر بیانات کو خارج کردیا تو ۴۰۰۰[2] رہ گئیں۔ یہ بھی سب کی سب معتبر اور قابل اعتماد نہیں ہیں۔ کیونکہ بسا اوقات آپس میں تضاد ومتناقض ٹھہرتی ہیں اور بعض اوقات قرآن کی ضدو نقیض قرار پاتی ہیں جیسا کہ معجزات محمدی کے بارے میں ابوداؤد نے پانچ لاکھ احادیث جمع کیں لیکن ان میں سے فقط چار ہزار کو قبول کیا[3]۔

لیکن جب ہم ان مفروضہ معجزات میں سے بعض پر غور کریں تاکہ ان کی حقیقت صفائی سے سمجھ میں آجائے۔

(۱۔) بخاری اپنے خیال میں ایک معتبر روایت سے یہ حکایت[4] بیان کرتا ہے کہ "نبی نے ایک جماعت کو ابو رافع کے خلاف بھیجا۔ چنانچہ عبداللہ ابن عتیک رات کے وقت جب وہ سورہا تھا اس کے گھر میں جا گھسا اور اس کو قتل کیا۔ لہذا عبداللہ ابن عتیک نے کہا اورمیں نے اپنی تلوار اس کے پیٹ میں ماری یہاں تک کہ اس کی پیٹھ تک پہنچ گئی اور میں نے اس کو مار ڈالا۔ پھر میں دروازے کھولنے لگا یہاں تک کہ میں ایک زینہ تک پہنچا۔ پھر میں نے اپنا قدم

[2] دیکھو شیخ عبدالحق دہلوی کا دیباچہ مشکواۃ مطبوعہ حیدری پریس ۲۹۸ ہجری

[3] کشف الظنون جلد دوم صفحہ ۳۴

[4] مشکواۃ صفحہ ۵۲۳، ۵۲۴۔

نیچے رکھا اور میں چاند نی[1] رات میں گر پڑا اور میری ٹانگ ٹوٹ گئی ۔ میں نے اسے ایک پٹی سے باندھ لیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف روانہ ہوا۔ میں نے نبی کے پاس آکر اس کو بتایا۔ تب اس نے کہا اپنا پاؤں آگے کر۔ میں نے پاؤں آگے کیا۔ اس نے اسے ملا اور وہ ایسا ہو گیا کہ گویا کبھی ٹوٹا ہی نہ تھا"۔ آئندہ باب میں ہم دیکھینگے کہ اس واقعہ سے حضرت محمد کا چال چلن کیسا ظاہر ہوتا ہے یہاں پر ہم فقط اتنا بتاتے ہیں کہ یہ حکایت ابن ہشام[2] اور ابن اثیر[3] اور روضۃ الصفا[4] کے مصنف نے بھی بیان کیا ہے۔ ان کے بیانات میں بہت تفاوت واختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ قاتل کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور کوئی اس کا بازو بتاتا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ اس کی کلائی میں موچ آگئی تھی۔ اس حکایت کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں حضرت محمد کے اس کو چنگا[5] کرنے کا ذکر تک نہیں پایا جاتا۔ لہذا ان سے کسی معجزہ کے وقوع میں آنے کی تائید نہیں ہوتی۔ لیکن اس امر میں سب متفق ہیں کہ ابورافع حالتِ خواب میں حضرت محمد کی تحریک سے قتل کیا گیا۔ اس حالت میں اگر حضرت محمد سے معجزہ ظہور میں آتا توایک نہایت عظیم اخلاقی مشکل ہم کو پیش آتی کیونکہ یہ ثابت کرنا پڑتا کہ عبداللہ ابن عتیک خونی کے فائدہ کے لئے خدا نے آنحضرت کو معجزہ کی قدرت بخشی۔

[1] مشکواۃ کے حاشیہ پر مرقوم ہے کہ اس نے چاندنی رات میں غلطی سے زینہ کو زمین سمجھا۔

[2] سیرۃ الرسول جلد دوم صفحہ ۱۶۲ ، ۱۶۳

[3] جلد دوم صفحہ ۵۵، ۵۶

[4] جل دوم صفحہ ۱۰۳

[5] ابن ہشام اور ابن اثیر کے بیان میں کوئی معجزہ بیان نہیں کیا گیا۔

(۲-) حضرت محمد کے اپنے پیاسے ساتھیوں کے لئے پانی مہیا کرنے کے بہت سے باہم مخالف ومتضاد بیانات پائے جاتے ہیں جن میں سے چند مشکواۃ میں مندرج ہیں ۔ ان میں سے نمونہ کے طور پر ہم ذیل کی حدیث نقل کرتے ہیں جس کا راوی جابر ہے۔ چنانچہ مشکواۃ کے صفحہ ۵۲۴ پر مرقوم ہے " الحدیبیۃ کے دن لوگ پیاسے تھے اور رسول اللہ کے پاس ایک چھوٹا سا مشکیزہ تھا جس میں سے آپ وضو وطہارت کرتے تھے پھر لوگوں نے آنحضرت سے کہا کہ ہمارے پاس وضو وطہارت اور پینے کے لئے پانی مطلق نہیں۔ فقط یہی ہے جو آپ کے مشکیزہ میں ہے ۔ اس پر آنحضرت نے مشکیزہ میں ہاتھ ڈالا اور آنحضرت کی انگلیوں کے درمیان سے پانی ایسا بہنے لگا جیسا کہ چشمے پھوٹتے ہیں۔ پس ہم نے پیا اور غسل وطہارت میں استعمال کیا"۔ جابر سے پوچھا گیا" تم کتنے تھے"؟ اس نے کہا " اگر ہم لاکھ بھی ہوتے تو ہمارے لئے کافی ہوتا۔ ہم ایک ہزار پانچسو تھے"۔ اوروں کے حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہزار چار سو تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ ۱۴۰۰ اور ۱۵۰۰ کے درمیان ۔ بعض کہتے ہیں کہ ۱۳۰۰ یا ۱۶۰۰ یا ۱۷۰۰ ۔ ابن عباس کہتا ہے کہ ۱۵۲۵ تھے۔ پھر بخاری[6] نے البرا ابن عازب کی روایت سے بہت کچھ مختلف قصہ بیان کیا ہے ۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ابن عازب نے کہا" الحدیبیہ ایک چاہ ہے۔ ہم نے اس کو خالی کردیا اور ایک قطرہ پانی بھی اس میں باقی نہ چھوڑا۔ رسول اللہ آئے اور اس کے کنارے پر پہنچے۔ وہ اس کے کنارے پر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے پانی کا ایک برتن طلب کیا اور وضو کیا۔ پھر منہ صاف کرکے دعا کی۔ پھر اس کو(یعنی باقی ماندہ

[6] مشکواۃ صفحہ ۵۲۴

پانی کو) اس میں (یعنی چاہ میں) ڈال دیا۔ پھر فرمایا اب تھوڑی دیر تک اس پر سے ہٹ جاؤ۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لئے اور اپنے گھوڑوں کے لئے پانی بھرا حتیٰ کہ وہاں سے کوچ[1] کرگئے"۔ اب معزز ناظرین خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ یہ کوئی معجزہ نہیں ہے کہ جب لوگ چاہ پر سے کچھ دیر کے لئے ہٹ گئے تو اس میں پانی جمع ہوگیا۔ پھر ایک لاکھ پیاسوں کی پیاس کو انگلیوں کے درمیان سے چشمہ جاری کرکے رفع کرنے میں اور اس چاہ کے قصہ میں زمین آسمان کا فرق ہے[2]۔

(۳۔) اس قسم کی بہت سی حکایات مندرج ہیں جن میں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت محمد کو رسول اللہ جان کر درخت اور پتھر سلام کرتے تھے اور آنحضرت کے حکم سے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے تھے۔ ہم ان حکایت میں سے فقط ایک کو منتخب کرینگے اگرچہ تہذیب کے تقاضا سے اس کے بعض الفاظ چھوڑدئے جائینگے۔ اس حکایت کو جابر سے روایت کرکے مسلم[3] نے یوں لکھا ہے " ہم رسول اللہ کے ساتھ جارہے تھے یہاں تک کہ چلتے چلتے ہم ایک کشادہ وادی میں پہنچے ۔۔۔اور کیا دیکھتے ہیں کہ وادی کے کنارے پر دو درخت ہیں۔۔۔۔۔ رسول اللہ نے ان میں سے ایک شاخ پکڑ کر کہا اللہ کے اذن سے میرے پیچھے پیچھے چلا آ۔ چنانچہ وہ آنحضرت کے پیچھے پیچھے اس اونٹ کی طرح چلنے لگا جس کی ناک میں نکیل ہو اور اپنے رہبر کے پیچھے آہستہ آہستہ چلے۔ یہاں تک کہ آپ دوسرے درخت کے پاس پہنچے۔ آپ نے اس کی ایک شاخ پکڑ کر کہا اللہ کے اذن سے میرے پیچھے چلا آ اور وہ بھی آپ کے پیچھے چل پڑا۔ یہاں تک

[1] اس حکایت کی اور صورتیں مشکواۃ کے صفحہ ۵۲۹ و ۵۳۰ پر مرقوم ہیں

[2] دیکھو صفحہ ۳۱۰

[3] مشکواۃ صفحہ ۵۲۵

کہ آپ دونوں درختوں کے درمیان ہوگئے ۔ پھر آپ نے فرمایا اللہ کے اذن سے میرے اوپر آپس میں مل جاؤ۔ پھر وہ درخت مل گئے "۔ جابر یہ بھی کہتا ہے کہ جب حضرت محمد ان درختوں سے فارغ ہوگئے تو میں نے خود نظر کی اور دیکھا کہ وہ پھر اپنی اپنی جگہ کو چلے گئے۔

(۴۔) پھر ایک اور قسم کے معجزات بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ ہم ان میں سے ایک کو انس[4] کی روایت سے ذیل میں درج کرتے ہیں " یقیناً ایک مرد تھا جو نبی کے لئے لکھا کرتا تھا۔ پھر وہ اسلام سے برگشتہ ہوکر مشرکوں میں مل گیا۔ اس پر نبی نے فرمایا البتہ اس کو زمین قبول نہیں کریگی ۔چنانچہ ابوطلحہ نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ اس ملک میں گیا جہاں وہ مرد مرا تھا اور اس کو قبر سے نکلا پڑا پایا۔ اس نے کہا اس مرد کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا ہم نے کئی بار اس کو دفنایا ہے اور زمین اس کو قبول نہیں کرتی "۔ علمایِ اسلام نے کبھی متفق ہوکر نہیں بتایا کہ یہ آدمی کون تھا۔

(۵۔) پھر بخاری[5] نے جابر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ " رسول اللہ وعظ کرتے وقت مسجد کے ستونوں میں سے ایک کھجور کے تنے پر تکیہ لگالیا کرتے تھے۔لہذا جب منبر بن گیا اور آنحضرت اس پر کھڑے ہوئے تو وہ کھجور کا تنہ جس کے پاس کھڑے ہو کر وعظ کیا کرتے تھے اس قدر زور سے رویا کہ پھٹنے لگا۔ اس پر رسول اللہ نے منبر سے اتر کر اسے گلے لگایا اور تب وہ اس بچے کی مانند رونے لگا جس کو دلاسا دے کر چپ کرایا جائے یہاں تک کہ وہ خاموش

[4] مشکواۃ صفحہ ۵۲۷

[5] مشکواۃ صفحہ ۵۲۸

ہو گیا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اس کا رونا اس سبب سے تھا کہ اب آئندہ کو یہ وعظ[1] سننے سے محروم رہیگا"۔

(۶۔) الترمذی[2] اور الدارمی[3] ذیل کی حکایت حضرت علی ابن ابی طالب کی روایت سے لکھتے ہیں "میں [4] مکہ میں نبی کے ساتھ تھا۔ ہم اضلاعِ نواحی میں سے ایک ملیں گئے۔ جو درخت یا پہاڑ سامنے آتا تھا السلام علیکہ یا رسول اللہ کہتا تھا"۔

(۷۔) ابن عباس بیان کرتا ہے کہ "ایک عورت رسول اللہ کے پاس اپنا بیٹا لائی اور کہنے لگی یا رسول اللہ میرے بیٹے میں دیو ہے۔ چاشت کے وقت اور شام کے کھانے کے وقت اس کو پکڑتا ہے۔ آنحضرت نے اس کی چھاتی کوملا اور دعا کی ۔ پس اس لڑکے نے قے کی اور اس کے اندر سے ایک کالا پلاسا نکل آیا"۔

(۸۔) الدارمی ایک حکایت بیان کرتا ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت نے ایک خاردار درخت کو اپنے پاس بلایا اور وہ زمین کو چیرتا ہوا آنجناب کی خدمت میں آکھڑا ہوا اور اس نے آنحضرت کے حکم سے تین بار یہ کلمہ پڑھا لا الہ اللہ وحدۃ لاشریک لہ وان محمد اعبدہ ورسولہ ۔

(۹۔) الترمذی[5] اس حکایت کی صداقت کا ذمہ لیتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحرائی پر آنحضرت کی نبوت ورسالت کو ثابت کرنیکے لئے آنحضرت کے حکم سے کھجوروں کا ایک خوشہ درخت سے گر پڑا اور پھر آنحضرت کے حکم سے اسی جگہ واپس جا کر لگ گیا جہاں پہلے تھا۔

(۱۰۔) ایک تڑکی کتاب مسمی بہ مرۃ کائنات میں ایک نہایت عجیب وغریب بیان مندرج ہے "ایک معجزہ ۔ حضرت محمد کے حالاتِ زندگی کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ جب آنحضرت طائف سے مکہ کی طرف آرہے تھے ایک بادل آپ کے سر پر آموجود ہوا۔ جبرائیل نے ظاہر ہو کر کہا اللہ تعالیٰ نے تیری قوم کی باتیں اور یہ سن کر کہ انہوں نے تجھ کو رد کیا ہے تیرے پاس وہ فرشتہ بھیجا ہے جو پہاڑوں کا نگہبان ہے تا کہ تو اس کو اپنا حکم بتائے۔ اس موقع پر اس فرشتہ نے آنحضرت کو سلام کیا اور کہا اے محمد تیرے رب نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے تا کہ تو مجھے اپنا حکم بتائے۔ لہذا اگر تو مجھے حکم دے تو میں دو پہاڑوں کو آپس میں ملادوں تا کہ جس قدر کافر ان کے درمیان ہیں سب ہلاک ہوجائیں ۔ رسول اللہ نے کہا ہر گز نہیں بلکہ میری اللہ تعالیٰ سے یہ عرض ہے کہ شاید ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو فقط اللہ ہی کی عبادت کریں اور اس کے سوا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔

اس قسم کی اور حکایت نقل کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ جو ان کو پڑھنا پسند کرتے ہیں ان کو کُتبِ ذیل میں بہت ملینگی۔ روضۃ الصفا[6] وروضۃ الاحباب اور جامع المعجزات فارسی میں اور مرۃ کائنات تڑکی میں اور جن کتابوں کا ہم اب تک ذکر کر چکے ہیں ان کے علاوہ اور بہت سی عربی کُتب میں۔ اس قسم کی حکایت اہلِ ہنود اور دیگر بُت پرست اقوام کی کتابوں میں بکثرت ہیں اور

---

[1] یہ بھی قرآن کا ایک نام ہے۔

[2] ۵۰۰ ھجری میں وفات پائی۔ دیکھو کشف الظنون جلد دوم صفحہ ۳۷

[3] مشکواۃ صفحہ ۵۳۶

[4] مشکواۃ صفحہ ۵۳۶، ۵۳۳

[5] مشکواۃ صفحہ ۵۳۳۔ مرۃ کائنات حصہ اول صفحہ ۴۱۵

[6] جلد دوم کو صفحہ ۱۳۳ سے شروع کرکے اور پھر صفحہ ۲۱۷ سے شروع کرکے پڑھ کر دیکھیں۔

بہت سے ممالک میں اب تک جاہل بت پرست ان کو مانتے ہیں لیکن وہ اپنے طرز وطریق میں حقیقی معجزات مندرجہ انجیل سے بالکل مختلف ومتفاوت ہیں۔ انجیلی معجزات پر قرآن خود گواہ ہے۔ ان مذکورہ بالااحادیث میں سے بعض ہم کو الف لیلہ ولیلہ کی حکایات یاددلاتی ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ کے عربوں کی بھی قوتِ متخیلہ بہت تیز تھی اور وہ افسانہ نگاری میں بڑے ماہر تھے۔ لیکن اس مقام پر یہ یادرہے کہ جن معجزات کا ہم نے ذکر کیا ہے ٹھیک انہیں میں سے بعض کی مانند قریش نے طلب کئے تھے۔ اگر حضرت محمد نے یہ معجزے دکھائے ہوتے تو قرآن کم از کم ان میں سے بعض کا توضرور ذکر کرتا۔ لیکن بخلاف اس کے قرآن کہتا ہے کہ حضرت محمد داروغہ نہ تھے بلکہ واعظ تھے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ کس لئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو معجزہ دکھانے کی قدرت بالکل عنایت نہ کی۔

اگرہمارے معزز ناظرین سیدنا مسیح اوراس کے رسولوں کے معجزات مندرجہ انجیل کے بیانات کو غور سے پڑھینگے توان کو صاف معلوم ہوجائے گا کہ وہ محمدی معجزات مندرجہ احادیث مخالفِ قرآن کی مانند نہیں بلکہ بالکل اورہی قسم کے ہیں۔انجیلی معجزات محض خلافِ فطرت حیرت انگیز واقعات نہیں جیسا کہ درختوں کا چلنا اور بولنا ، لکڑی کے ستون کا چلانا اوربچے کی طرح رونا اور ایک خونی کے بازو یا پاؤں کو چھو کر چنگا کرنا وغیرہ بلکہ وہ تمثیلوں کے طورپر روحانی نصیحتوں سے معمور اور خدا کی رحمت ومحبت اور قدرت کے کام ہیں جیسا کہ کوڑھیوں کو پاک وصاف کرنا۔اندھوں کی آنکھیں کھولنا اور مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ(متی ۱۱: ۴، ۵، لوقا ۷: ۲۲)۔لیکن مسیح نے کبھی کسی خونی وقاتل کو اس کے جرم کے کسی نتیجہ سے بچانے کے لئے معجزہ نہیں کیا اور نہ اس نے درختوں کو چلانے اورپتھروں کو بلانے میں الہیٰ قدرت صرف کی۔

علاوہ بریں جن کتابوں میں مسیح کے معجزات کا بیان مندرج ہے وہ اس کے آسمان پر چڑھ جانے سے بہت عرصہ بعد کی تصنیف نہیں ہیں (بلکہ اس کے بہت سے پہلے شاگردوں کی حین حیات ہی میں لکھی گئی تھیں اوریہ سب کچھ الہیٰ ہدایت سے لکھا گیا تھا اور بعض کتب کے لکھنے والے خود شاگرد ہی تھے)۔ انجیل متی اورانجیل یوحنا،اور بعض ان کی سند وتصدیق سے لکھی گئیں (انجیل مرقس اورانجیل لوقا)۔ اس بات پر یقین کرنے کے لئے معقول دلائل موجود ہیں کہ مسیح کے بعض عجیب کاموں کا اوراسکے کلام کا مختصر بیان عین اسی وقت قلمبند کیا گیا تھا ۔ برعکس اس کے جو معجزات احادیث میں حضرت محمد سے منسوب کئے گئے ہیں وہ آنحضرت کی وفات کے سینکڑوں سال بعد تحریر میں آئے ۔انجیل میں مسیح خود اپنے معجزات[1] کو اپنے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں پیش کرتا ہے حالانکہ برعکس اس کے قرآن میں حضرت محمد کے معجزات کی نفی[2] اور مسیح کے معجزات کا اقرار[3] مندرج ہے۔

اب ہم مختصراً مسیح کے معجزات اور حضرت محمد کے معجزات مندرجہ احادیث میں فرق بیان کرینگے۔

اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ بہت سے لوگوں نے سیدنا مسیح کے معجزات کے پہلے گواہ تھے محنت ومشقت اورخطروں اور مصیبتوں میں زندگی

---

[1] دیکھو یوحنا ۱۰: ۲۵، ۳۲، ۳۷، ۳۸و۱۴: ۱۱، ۱۲و۵: ۲۴

[2] سورۃ اسرائیل آیت ۶۱

[3] سورۃ آل عمران آیت ۴۸

بسر کی اور یہ سب کچھ انہوں نے اپنی شہادت کے بیان پر اپنے ایمان کے سبب سے خوشی سے برداشت کیا اوراسی سبب سے ان کا چال چلن بھی بالکل نیا ہوگیا۔

اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ حضرت محمد کے مذکورہ معجزات کے گواہوں نے اپنی گواہی کے سبب سے اور ان معجزات پر اپنے ایمان کے باعث اس قسم کی زندگی بسر کی ہو۔

احادیث کی تالیف حضرت محمد سے اس قدر بعد میں ہوئی اوران کے بیانات ایسے عجیب ہیں کہ کوئی عالم آنحضرت کے معجزات کے بارے میں ان پر بالکل اعتماد نہیں کرسکتا اگرچہ ممکن ہے کہ آنحضرت کی زندگی کے دیگر معاملات کے باب میں وہ قابل اعتماد ہوں۔ مشکواۃ اورحیات الیقین اور عین الحیات اور دیگر مشہور کتابوں میں جوسنی وشیعہ ہر دوفریق میں مروج ہیں ایسے عجیب وغریب بیانات مندرج ہیں کہ ان سے تمام احادیث کے بارے میں شک پیدا ہوتاہے مثلاً لکھاہے کہ بہشت کی نہروں کے کناروں پر باکرہ عورتیں پھولوں کی طرح زمین سے پیدا ہوتی ہیں اورمسلمان جب چاہتے ہیں ان کو جمع کرلیتے ہیں۔ پھر مرقوم ہے کہ بہشت میں پکے پکائے پرندے مسلمانوں کے دستر خوانوں پر آبیٹھتے ہیں اور جب مسلمان خوب پیٹ بھر کے کھاچکتے ہیں تو پھر اڑجاتے ہیں ۔ نیز یہ کہ جب خدا نےآدم کوپیدا کرنا چاہا توجبرائیل کو بھیجا کہ زمین سے ایک مٹھی خاک لائے۔ زمین نے کہا تجھے خدا کی قسم ہے جومجھ سے کچھ لے اور جبرائیل خالی ہاتھ واپس چلا گیالیکن آخر کار عزرائیل زبردستی سے لے گیا۔ پھرکہا جاتاہے کہ حضرت محمد نے فرمایا کہ ایک فرشتہ مرغ کی صورت کا ہے جس کے پاؤں زمین کے ساتویں طبقہ کے نیچے ہیں درحالیکہ اس کا سر عرشِ الہیٰ کے آستانہ تک پہنچتا ہے۔ پھر ایک اور مقام پر لکھاہے کہ جب حوا نے گندم کو کھانا چاہا تو پودا اس سے بچنے کے لئے ۵۰۰ سال کی راہ بلند ہوگیا ۔پھر مرقوم ہے کہ عرشِ الہیٰ کے دربان کے کان سے کندھے تک ۷۰ سال کی راہ ہے۔

علاوہ بریں کم از کم شیعہ صاحبان کےعلما تسلیم کرتے ہیں کہ صحیح احادیث میں بھی باہمی تناقض اور اشتباہ کاوجود پایا جاتاہے۔ چنانچہ یہ بات ذیل کی عبارت سے جوکہ ابوجعفر نے اپنی کتاب کافی میں علی ابن ابراہیم کی روایت سے لکھی ہے صاف عیاں ہے وہ لکھتاہے کہ "ایک دفعہ میں نے حضرت محمد کی احادیث کے بارے میں حضرت علی سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ وہ ایک دوسری کی مخالف ہیں اور قرآن کی بھی مخالفت کرتی ہیں ۔ یہاں تک کہ توخود بھی ان کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا اورمیں نے اس سے پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے اورایسی حالت میں صحیح حدیث کو دریافت کرنا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے ؟ تب علی ابن ابی طالب نے اس کے جواب میں صحیح اور غیر صحیح احادیث میں تمیز کرنے کے چند قواعد بیان کئے۔ علی ابن ابراہیم کی اس سے بھی تسکین نہ ہوئی اوراس نے کہا کہ اگر تمام فتہا وقضاۃ دونوں کی طرح یعنی باہم متضادو متناقض احادیث پر متفق ہوں؟ اس نے جواب دیا کہ یہ دریافت کرنا چاہیے کہ فقہا وقضاۃ کس طرف بہت مائل نہیں ہیں۔ تب ایسی کو چھوڑ کر دوسری کو قبول کرنا چاہیے۔ پھر اس نے کہا کہ اگر فقہا دونوں پر متفق ہوں؟ پھر اس نے

جواب دیا کہ اگر ایسا ہو تو اپنے امام کے آنے تک انتظار کرو کیونکہ ہلاکت کو قبول کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی شک کی حالت میں [1] رہے۔

حاصلِ کلام ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت محمد کے دعویٰ نبوت ورسالت کی معجزات سے تائید نہیں ہوتی جیسا کہ قرآن سے صاف ثابت ہے اور جو معجزات احادیث میں مندرج ہیں وہ بہت ہی لایعنی اورآیاتِ قرآن کے متناقض ہیں اور ان کا بیان اکثر ایسا ہے کہ ان کا فی الحقیقت وقوع میں آنا ہر گز ہر گز قبول نہیں کیا جاسکتا۔

[1] نیز دیکھو شیخ جعفر کا رسالہ رس کا ۳۵واں باب

# چھٹا باب

## حضرت محمد کے چال چلن کی بعض باتیں جو قرآن میں مذکور اور مسلمان مورخین ومفسرین کی تصانیف میں مشروح ہیں ان کی تحقیق تاکہ معلوم ہو کہ ان سے آنحضرت کے دعویٰ نبوت ورسالت کی کہاں تک تائید ہوتی ہے

اب ہم حضرت محمد کے بعض افعال اورحالات زندگی پر غور کرینگے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ ان سے آنحضرت کے نبی اللہ اور رسول اللہ ہونے کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق مناسب ہے کہ نہایت ادب ولحاظ اور تہذیب کے ساتھ لکھا جائے تاکہ مسلمان پڑھنے والوں کا دل نہ دُکھے ۔ لہذا ہم یونانی اور دیگر مسیحی مصنفین کی تصانیف سے کچھ اقتباس نہیں کرینگے بلکہ فقط بڑے بڑے مشہور مسلمان مصنفین ہی کے بیانات کو پیش کرینگے۔ اس امر کے متعلق ہم کوئی اپنا فیصلہ بھی نہیں سنائینگے کیونکہ پولوس رسول فرماتا ہے " تو کون ہے جو دوسرے کے نوکر پر الزام لگاتا ہے؟ اس کا قائم رہنا یا گرپڑنا اس کے مالک ہی سے متعلق [2] ہے"۔ ہم سب کے سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور

[2] رومیوں کا خط ۱۴: ۴

وہی اکیلا تمام بنی آدم کا انصاف کرنے والا ہے۔ لیکن ہم میں سے ہر ایک کے لئے اس مضمون پر اپنا خیال قائم کرنا بھی ناگریز ہے اگرچہ اس کو ظاہر کرنے کی ہم سے درخواست نہ کی جائے۔ اس خیال سے کہ ہمارے معزز پڑھنے والوں پر حقیقتِ حال منکشف ہوجائے اور وہ خود فیصلہ کرسکیں کہ حضرت محمد فی الحقیقت ویسے ہی تھے یا نہیں جیسے کہ اہلِ اسلام ان کو مانتے ہیں ہم چند آیاتِ قرآن کو پیش کرینگے اورتا کہ ان کے معانی کے متعلق غلط فہمی کا شک نہ رہے ان کے ساتھ ہی ان کی مشہور اسلامی تفاسیر کو بھی نقل کرینگے۔ علاوہ بریں ہم حضرت محمد کے مسلمان سوانح عمری لکھنے والوں اور مورخین کے بعض بیانات اور مقبولِ عام احادیث کو بھی پیش کرینگے تاکہ یہ حقیقت خوب ظاہر ہوجائے کہ جب آنحضرت نے مدینہ میں بنی اوس اور خزرج کے اتحاد واسلام قبول کرنے کے سبب سے قدرت حاصل کی تو کیسی روش اختیار کی۔ ہم اپنے معزز پڑھنے والوں کو یاددلانا چاہتے ہیں کہ ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہے بلکہ ان امورِ زیر تحقیق کے متعلق جو کچھ مصنفین اسلام نے لکھا وہی نقل کررہے ہیں۔

جو امور ہم نے تحقیق اور غور کرنے کے لئے منتخب کئے ہیں وہ یہ ہیں

(۱) حضرت محمد کے نکاح وشادی کے معاملات اور (۲) آنحضرت کا اپنے دشمنوں سے سلوک۔ صاحبِ علم پڑھنے والے محسوس کرینگے کہ ان ہر دوامور کے متعلق جو اقتباسات ہم نے پیش کئے ہیں ان کی جگہ ہم دیگر مصنفین اسلام کی تصانیف سے بآسانی ایسے بیانات پیش کرسکتے تھے جو زیادہ مفصل ومشرح ہوتے لیکن ہم نے چاہا کہ فقط مستند اور قابل اعتماد مصنفین ہی کے بیانات کو پیش کریں اور تمام مبالغہ آمیز وخیالی حکایات سے پرہیز کریں۔ مبالغہ پسند اوروہم پرست مصنفین نے یہ نہ جان کر کہ ان کے بیانات منصف مزاج محققین کی نظر میں کیسے ٹھہرینگے ایسی باتیں بیان کی ہیں جو حضرت محمد کے چال چلن کو بہت ہی بُری صورت میں ظاہر کرتی ہیں۔لہذا ہم نے ان کو چھوڑ کر زیادہ تر فقط قدیم اورمقابلِ اعتماد عربی مصنفین ہی کے بیانات کو پیش کیا ہے اگرچہ بعض اوقات فارسی وترکی تصانیف کا بھی حوالہ دیا گیاہے تاکہ یہ بات صاف ظاہر ہوجائے کہ جن امور کی ہم تحقیق کررہے ہیں ان کے وجود کے باب میں تمام اسلامی دنیا متفق ہے۔

۱۔ نکاح وشادی کے متعلق سورۃ النسا کی تیسری آیت میں یہ قانون مندرج ہے کہ ہر ایک مسلمان ایک یا دو یا تین یا چار بیویاں اکٹھی رکھ سکتا ہے اوران کے علاوہ جس قدر لونڈیاں قبضہ میں ہوں سب حلال ہیں۔ البیضاوی " ماملکت ایمانکم " کا مفہوم حرم یا سراری یعنی غلام لڑکیاں بیان کرتا ہے ۔ یہ آیت مسلمانوں میں ہمیشہ کے لئے کثیر الازواجی اور حرموں کو جائز قرار دیتی ہے اوراس طرح سے بہت سی قباحتوں کو جواس سے پیدا ہوئی ہیں اور جن سے اسلامی ممالک پُرہیں دائمی بنادیتی ہے لیکن اس آیت کی نہایت کشادہ حدود سے بھی حضرت محمد کی کثیر الازواجی[1] محدود نہ ہوئی کیونکہ سورۃ الاحزاب کی ۴۹ ویں اور ۵۰ ویں آیت میں آنحضرت کو ایک خاص حق حاصل ہوا چنانچہ مرقوم ہے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَن يَسْتَنكِحَهَا

[1] روضۃ الاحباب میں شوہر کی حیثیت میں آنحضرت کا طرزِ عمل نہایت مفصل طور پر مرقوم ہے۔

خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ اے نبی ہم نے حلال کیں تجھ پر تیری عورتیں جن کے مہر تو دے چکا اور جو مال ہو تیرے ہاتھ کا جو خدا نے تجھ کو عنایت کیا اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالات کی بیٹیاں جنہوں نے وطن چھوڑا تیرے ساتھ اور جو کوئی عورت ہو مسلمان اگر اپنی جان نبی کو بخشے اور اگر نبی چاہے کہ اس کو نکاح میں لے۔ یہ خاص ہے تیرے لئے سوا سب مسلمانوں کے ۔ ہم کو معلوم ہے جو ٹھہرادیا[1] ہم نے ان پر ان کی عورتوں میں اور ان کے ہاتھ کے مال میں تاکہ تم پر گناہ نہ رہے۔ ان آیات کی تفسیر میں بیضاوی[2] یوں لکھتاہے " ایک خاص حق وغیرہ سے یہ ظاہر ہوتاہے کہ جو کچھ آنحضرت کو نبی ہونے کی عزت میں عنایت ہوا یہ بھی اسی کا حصہ ہے اوراس بات کااظہار واقرار ہے کہ خدا آنحضرت کو اس قدر عنایت کے لائق سمجھتاہے "۔"ایک خاص حق" جس لفظ کا ترجمہ کیا گیاہے اس کے معانی میں بیضاوی نے " خالص دوستی" اور " خاص انعام" بھی لکھاہے یہ سمجھنے کے لئے کہ حضرت محمد نے اس " خاص حق " سے کہاں تک کام لیا اور فائدہ اٹھایا یہ یادرکھنا چاہیے کہ جب آنحضرت نے وفات پائی اس وقت نوبیویاں زندہ تھیں اوران کے علاوہ مریم وریحانہ دولونڈیاں بھی موجود تھیں۔ ابن ہشام بتاتا ہے کہ حضرت محمد نے کل تیرہ عورتوں سے نکاح کیا۔ عائشہ فقط چھ یا سات سال کی عمر تھی جب نکاح کی رسم ادا کی گئی اور نو یا دس سال[3] کی عمر میں جبکہ وہ ابھی گڑیوں سے کھیلتی تھی اس سے ہم خوابی ومباشرت شروع ہوگئی۔

مصری مریم جو اس وقت کے حاکمِ مصر نے حضرت محمد کو بھیجی تھی اس کے بارے میں سورۃ التحریمہ کی پہلی دو آیتوں میں یوں مرقوم ہے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ یعنی اے نبی تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تجھ پر حلال کیا؟ تو اپنی عورتوں کی رضامندی چاہتا ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اللہ نے تمہارے لئے تمہاری قسموں کا اتارڈالنا ٹھہرادیا اور اللہ تمہارا مالک ہے اور وہ علیم وحکیم ہے۔ بیضاوی ان آیات کے دو مختلف مطلب بیان کرتا ہے لیکن جس کی دیگر مفسرین بھی تائید کرتےہیں وہ یہ ہے " بیان[4] کیا گیاہے کہ حضرت محمد عائشہ یا حفصہ کی باری میں مریم کے ساتھ تخلیہ میں تھے۔ حفصہ کو اس کا پتہ لگ گیا اوراسلئے اس نے آنحضرت کو ملامت کی۔ آنحضرت نے مریم کو اپنے آپ حرام قرار دے دیا۔ اس لئے یہ آیت نازل ہوئیں " یہ تمام کہانی جو کہ ترقی تہذیب کے لئے بالکل مفید نہیں روضۃ الصفا[5] میں بالتفصیل مندرج ہے اور دیگر کتب میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہم نے اس کی مختصر اور سادہ صورت کو منتخب کیاہے تاکہ ان تفصیلات سے بچیں جو ان اوراق کے لائق نہیں ہیں۔ لیکن اس واقعہ سے جو روشنی حضرت محمد کے چال چلن پر پڑتی ہے وہ قابلِ لحاظ

---

[1] یعنی سورۃ النسا کی تیسری آیت میں۔

[2] جلد دوم صفحہ ۳۲

[3] ابن ہشام جلد سوم صفحہ ۹۴۔ ابن کثیر جلد دوم صفحہ ۱۱۷و۱۱۸، مشکواۃ صفحہ ۲۶۲، ۲۷۲

[4] تفسیر بیضاوی جلد دوم صفحہ ۳۴۰و۳۴۱

[5] جلد دوم صفحہ ۱۸۸

ہے۔ علاوہ بریں یہ عجیب وحی آسمانی بھی قابل غور ہے جس کو حق سبحانہ وتعالیٰ نے قسم توڑنے اوران افعال کے جواز کے لئے نازل فرمایا جن کا مفسرین نے ذکر کیاہے۔

زینب بنت جحش حضرت محمد کے متنبیٰ زید ابن حارث کی بیوی کے ساتھ آنحضرت کی شادی کے متعلق سورۃ الاحزاب کی ۳۷ویں اور ۳۸ویں آیت میں یوں مرقوم ہےوَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا مَّا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا یعنی اورجب توکہنے لگا اس شخص سے جس پر اللہ نے احسان کیا اور تونے احسان کیا رہنے دے اپنے پاس اپنی جورو کو اور ڈراللہ سے اور توچھپاتا تھا اپنے دل میں ایک چیز جس کو اللہ ظاہر کیا چاہتا تھا اور توتوڑتا تھا لوگوں سے اور تجھ کو زیادہ ڈرنا چاہیے اللہ سے۔ پھر جب زید تمام کرچکا اس عورت سے اپنی غرض ہم نے وہ تیرے نکاح میں کردی تاکہ نہ رہے سب مسلمانوں کو گناہ اپنے لے پالکوں کی جوروؤں سے نکاح کرنا جب وہ ان سے اپنی غرض تمام کرچکیں اور اللہ کا حکم عمل میں آگیا۔ نبی پر کچھ گناہ نہیں اس بات میں جو اس کے واسطے اللہ نے ٹھہرادی۔ دستور رہا اللہ کا ان لوگوں میں جوپہلے گذرے اور اللہ کا حکم مقرر ٹھہر چکاہے۔

آیات منقولہ بالامیں جس زینب کی طرف اشارہ ہے اس کے بارے میں جلالین [1] نے یوں لکھاہے " نبی نے اسے زید کو بیاہ دیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد آنحضرت کی نظر اس پر پڑ گئی اور آنحضرت کی جان میں اس کی محبت آگئی اور زید کی روح میں اس سے نفرت پیدا ہوگئی۔ اس نے نبی سے کہا میں اس سے جدا ہونا چاہتا ہوں۔ اس لئے آنحضرت نے کہا اپنی جورو کو اپنے پاس رہنے دے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ---- پھر زید نے اس کو طلاق دے دی اوراس کی عدت کا زمانہ پوراہوگیا "۔ اور وزوجنکھا کے متعلق وہ کہتے ہیں چنانچہ نبی بے اجازت ہی اس کے پاس اندر چلا گیا اور آنحضرت نے مسلمانوں کی گوشت روٹی سے ضیافت کی "۔

بیضاوی کہتا ہے [2] "اپنی جورو کو اپنے پاس رہنے دے یعنی زینب کو اور چونکہ حضرت محمد نے اسے زید کو بیاہ دینے کے بعد دیکھا اور آنحضرت کے دل میں اس کے لئے محبت پیدا ہوگئی اس لئے آنحضرت نے فرمایا اللہ کی حمد ہو جو دلوں کو پھیرنے والا ہے اور زینب نے یہ الفاظ سن لئے اور زید کو بتایا۔ وہ فوراً سمجھ گیا اوراس کے دل میں زینب کی صحبت سے نفرت پیدا ہوگئی ۔اس لئے اس نے نبی پاس آکر کہا میں اپنی بیوی کو چھوڑتا چاہتا ہوں۔ آنحضرت نے کہا تجھ کو کیا ہوگیا ہے؟ کیا تو کسی طرح سے اس پر شک کرتا ہے؟ زید نے عرض کی کہ نہیں۔ بخدا میں نے اس سے نیکی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا لیکن فی الحقیقت میرے لئے وہ بہت ہی بزرگ ہے۔ اس پر آنحضرت نے اس سے کہا اپنی بیوی کواپنے پاس رہنے دے۔--- لہذا جب زید اس سے اپنی حاجت

[1] ۳۶ویں آیت کی تفسیر میں۔

[2] جلد دوم صفحہ ۱۲۹

پوری کرچکا۔ چونکہ وہ اس سے تنگ آگیا اور اسکی عدت کے ایام پورے ہوگئے ---ہم نے اسے تیرے نکاح میں کردیا ---۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے آنحضرت کو اس سے نکاح کرلینے کا حکم دیا یا خدا نے بغیر مہر کے اسے آنحضرت کی بیوی بنادیا اوراس تفسیر کی اس حقیقت سے تائید ہوتی ہے کہ زینب آنحضرت کی دوسری بیویوں کوکہا کرتی تھی کہ یقیناً میرے نکاح میں خدا نے رشتہ دار کا کام کیا اور تمہارے نکاح کی یہ حقیقت ہے کہ تمہارے رشتہ داروں نے تم کو بیاہ دیا۔ یہ بھی بیان کیا جاتاہے کہ اس نکاح کے معاملہ میں زید درمیانی تھا اور یہ اس کے ایمان کی سخت آزمائش اور مضبوطی کی دلیل تھی"۔ ان آخری چند الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ بیضاوی نے پورے طور سے محسوس کیا کہ آنحضرت کے اس فعل نے بہت سے لوگوں کوآنحضرت کی نبوت ورسالت کے باب میں شک میں ڈال دیا۔

صفیہ وریحانہ اور بعض دیگر بیویوں اور لونڈیوں کے ساتھ حضرت محمد کے تعلقات کا بیان ابن ہشام کی سیرۃ الرسول تواریخ ابن اثیر ، روضۃ الصفا، روضۃ الاحباب اور بعض دیگر مسلمانوں [1] کی تصانیف میں مرقوم ہے۔ اس بیان کو پڑھنا نہ توکچھ دل پسند ہے اور نہ ترقی تہذیب کے لئے ہی مفید ہے۔ فقط حضرت محمد کے چال چلن پر روشنی ڈالتا ہے۔ لیکن اس مضمون پر جوکچھ کہا گیا ہے ہم اسی پر اکتفا کرینگے۔

[1] مثلاً سفیہ کے بارے میں دیکھو کتاب النغازی ازواقدی صفحہ ۱۳۱ ، ۱۳۳

۲۔ اب ہم اس بات پر غور کرینگے کہ حضرت محمد نے اپنے دشمنوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ اس کے متعلق بھی ہم بہت سے واقعات میں سے فقط چندہی کا بیان کرینگے۔

ابن ہشام بیان کرتا ہے ک یہودیوں میں سے ایک فرقہ بنی قریظہ نے اپنے آپ کو حضرت محمد کے حوالہ کردیا اور حضرت محمد نے ان کا فیصلہ ان کے زخمی دشمن سعد ابن معاذ کےہاتھ میں چھوڑدیا اورپھر یہ مورخ اس قصہ کو یوں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ سعد [2] نے کہا انی احکمہ فیھمہ ان تقتل الرجال وتسبی الذراری والنساء وتقسم الاموال یعنی ان کے لئے میرا فیصلہ یہ ہے کہ تومردوں کو قتل کرے عورتوں اور بچوں کو غلام بنائے اور مال کو تقسیم کرے---۔ ابن اسحاق کہتاہے کہ نبی اللہ نے سعد سے کہا لقد حکمت فیھم بحکمہ اللہ من فوق سبعۃ ارقعۃٍ یعنی ان کے حق میں تیرا فیصلہ ہفت فلک پر سے خدا کے فیصلہ کے مطابق ہے---چنانچہ رسول اللہ نے ان کو مدینہ میں حارث کی بیٹی کے گھر میں قید کیا۔ یہ حارث کی بیٹی بنی نجار میں سے تھی۔ پھر رسول اللہ مدینہ کے بازار میں گئے اور خندقیں کھدوائیں ۔ پھر ان کو طلب کرکے ان کے خندقوں میں قتل کیا۔ جب وہ طلب کئے گئے توآنحضرت کے حضور میں حاضر ہوئے اوران کے درمیان خدا کا دشمن حی ابن اخطب اور کعب ابن اسد قوم کے سردار تھے اور وہ سب کے سب ۶۰۰ یا ۷۰۰ تھے اور جو ان کا بہت زیادہ شمار بتاتاہے کہتا ہے ۸۰۰ اور ۹۰۰ کے درمیان تھے اورجب کعب ابن اسد ان کے ساتھ رسول اللہ کی طرف جارہا تھا انہوں نے اس سے کہا اور کعب تیرے خیال میں وہ

[2] سیرۃ الرسول حصہ دوم صفحہ ۱۴۸ واقدی کتاب المغازی صفحہ ۱۲۵ ، ۱۲۶

ہمارے ساتھ کیا سلوک کریگا؟ اس نے کہا ---- کیا تم نہیں سمجھتے ہو؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ جو شخص بلاتا ہے وہ اپنے فعل سے باز نہیں آتا اور جو کوئی تم میں سے اس کے پاس جاتا ہے لوٹ کر نہیں آتا ؟ بخدا یہ قتل عام ہے۔ پس یوں ہی ہوتا رہا یہاں تک کہ رسول اللہ نے ان سب کو ختم کردیا۔ حی بن اخطب خدا کا دشمن حاضر کیا گیا اوراس پر ایک منقش گلرنگ چوغہ تھا---۔ جب اس نے رسول اللہ کو دیکھا توکہنے لگا بخدا یقیناً میں نے تیرے ساتھ دشمنی کرنے پراپنے کو ملامت نہیں کی لیکن خدا جس کو ترک کرتا ہے ترک ہی کردیتا ہے۔ پھر وہ مردوں کی طرف متوجہ ہو کرکہنے لگا۔ مردو! خدا کے حکم میں کچھ نقصان نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کے حق میں خدا نے قتل مقرر کیا ہے۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور اس کا سر قلم کیا گیا--۔ عائشہ بیان کرتی ہے کہ ان کی عورتوں میں سے فقط ایک عورت قتل کی گئی ----۔ وہ میرے پاس تھی اورجب رسول اللہ اس کی قوم کے مردوں کو بازار میں قتل کررہے تھے وہ ظاہر وباطن میں ہنس رہی تھی۔ جب پکارنے والے نے اس کا نام پکارا کہ فلاں عورت کہاں ہے تواس نے کہا بخدا وہ میں ہوں۔ میں نے اسے کہا افسوس تجھ پر۔ تیرا کیا حال ہے؟ اس نے کہا میں قتل کی جاؤنگی ۔ میں نے پوچھا کیوں؟ اس نے جواب دیا انہیں باتوں کے لئے جو میں کررہی ہوں۔ پھراس کو لے گئے اور وہ قتل کی گئی ۔ عائشہ کہا کرتی تھی بخدا میں اس کے بارے میں اپنے تعجب کو نہیں بھولتی۔ اس کی شخصی خوبصورتی اوراس کی وہ قہقہہ زنی جبکہ وہ خوب جانتی تھی کہ ابھی قتل کی جاؤنگی۔ یہ وہی تھی جس نے خلاد ابن سوید پرچکی پھینکی تھی---۔ ابن اسحاق کہتا ہے رسول اللہ نے ان آدمیوں کے قتل کا حکم دیا تھا جو سن بلوغ کو پہنچ چکے تھے۔ پھر یقیناً رسول اللہ نے بنی قریظہ کے مال اوران کی عورتوں اوران کے بچوں کو مسلمانوں میں تقسیم کردیا-----۔ پھر رسول اللہ نے بنی عبد اللہ شھل کے بھائی سعد بن زید انصاری کو بنی قریظہ کے کچھ قیدیوں کے ساتھ نجد میں بھیجا اور وہاں اس نے ان کے عوض میں گھوڑے اورہتھیار خریدے اوران کی عورتوں میں سے ریحانہ بنت عمرو بن خنافہ کو رسول اللہ نے اپنے لئے پسند کیا----۔ اور وہ رسول اللہ کے ساتھ تھی جب تک کہ آنحضرت نے وفات نہ پائی اور وہ آنحضرت کی لونڈیوں میں تھی۔ رسول اللہ نے چاہا کہ اس سے نکاح کرکے اس کو پردہ میں داخل کریں لیکن اس نے کہا مجھے اپنی لونڈیوں ہی میں رہنے دیجئے کیونکہ اس میں میرے لئے اورآپ کے لئے آسانی ہے۔

جنگِ بدر کے بعد جب مسلمان اپنے مقتول دشمنوں کی لاشوں کو ایک پرانے [1] چاہ میں پھینک چکے اوراپنے قیدیوں کے ساتھ مدینہ کو واپس جارہے تھے توان قیدیوں میں سے بعض قتل کئے گئے ۔ ابن [2] اسحاق نے اس واقعہ کا بیان یوں کہا ہے " جب رسول اللہ الصفرا میں تھے توجیسا کہ مکہ کے بعض علما نے مجھے بتایا ہے النصر ابن حارث قتل کیا گیا ۔ علی ابن طالب نے اسے قتل کیا---۔ پھر آنحضرت آگے آگئے یہاں تک کہ عرق الظبیہ میں وارد ہوئے اور عقبہ بن ابی معیط قتل کیا گیا۔ جب رسول اللہ نے اس کے قتل کا حکم دیا توعقبہ نے کہا اور محمد پھر میری چھوٹی سی بیٹی کے لئے محافظ ومربی کون ہوگا؟ آنحضرت نےکہا آتشِ دوزخ۔

---

[1] ابن ہشام جلد دوم صفحہ ۲۲

[2] جلد دوم صفحہ ۲۵ ابن اثیر نے جلد دوم صفحہ ۴۹ پریہی قصہ مندرج کیا ہے۔

کعب بن الاشرف کے قتل کا قصہ ابن ہشام نے سیرۃ[1] الرسول میں یوں لکھا ہے" تب کعب ابن الاشرف مدینہ میں واپس پہنچا اور مسلمانوں کی عورتوں کی خوبصورتی کی اس قدر تعریفیں کیں کہ ان کو برافروختہ کردیا۔ لہذا رسول اللہ نے کہا۔۔۔۔ ابن الاشرف کےمعاملہ میں میرے لئے کون ہے؟ محمد بن مسلمہ نے کہا یارسول اللہ اس کے معاملہ میں میں آپ کے لئے ہوں۔ میں اس کو قتل کرونگا۔ پھر آنحضرت نے کہا اچھا گر تو ایسا کرسکتا ہے تو کر۔ پس محمد ابن مسلمہ آکر تین روز تک ٹھہرارہا۔ وہ کچھ کھاتا پیتا نہ تھا مگر فقط اتنا کہ زندہ رہ سکے۔ اس نے رسول اللہ سے ذکر کیا۔ تب آنحضرت نے دعا کی اوراس سے کہا تونے کھانا پینا کیوں چھوڑدیا ہے؟ اس نے کہا یارسول اللہ میں نے آپ سے ایک بات کہی اورمیں نہیں جانتا کہ میں آپ کے لئے وہ بات کرسکونگا یا نہیں۔ (آنحضرت نے) کہا بیشک کوشش کرنا تیرا فرض ہے۔۔۔ اس کے قتل کے لئے محمد ابن مسلمہ ۔سلکان ابن سلامہ ابن وتش جو کعب بن اشرف کا رضاعی بھائی تھا اوریہی ابونائلہ بنی عبدالاشھل میں سے ہے۔ عبادا بن بشر ابن وتش۔حارث ابن بشرابن معاذ اورابوعبس ابن جبر جمع ہوئے ۔اس کے پاس جانے سے پیشتر انہوں نے سلکان ابن سلامہ ابونائلہ کوخدا کے دشمن کعب ابن الاشرف کے پاس بھیجا۔ اس نے جا کر کچھ دیر تک اس سے گفتگو کی اور انہوں نے ایک دوسرے کواشعار سنائے اورابونائلہ شعر پر شعر[2] نقل کرتا گیا۔ پھر اس نے کہا ابن الاشرف تونے خوب کیا! میں ایک ضرورت تجھ سے بیان کرنے کو آیا ہوں۔ تواسے پوشیدہ رکھنا۔اس نے کہا میں ایسا ہی کرونگا۔ ابونائلہ نے کہا اس آدمی[3] کا آنا ہمارے لئے بڑی مصیبت کا باعث ہوا ہے۔ اس کے سبب سے عربوں نے ہمارے راستے روک رکھے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے خاندان تباہ ہوگئے ہیں اور ہماری جانیں لاغر ہوگئی ہیں۔ہم اپنے خاندانوں سمیت سوکھ گئے ہیں۔ کعب نے کہا بیشک یہ باتیں ایسی ہیں یقینی ہیں جیساکہ میں ابن الاشرف ہوں۔اورابن سلامہ بخدا کیا میں تجھے نہیں کہا کرتا تھا کہ جیسا میں کہتاہوں۔ویسا ہی حال ہوگا؟ سلکان نے اس سے کہا میں چاہتا ہوں کہ توہم کوکھانا مول دے اورہم تیرے ساتھ ایک اقرار کرینگے اورعہد باندھینگے اور تواس معاملہ میں نیکی کریگا۔ اس نے کہا کیا تم میرے پاس اپنے بال بچے گِرو گروگے؟(ابونائلہ نے) کہا توہم کو بے عزت کرنا چاہتا ہے۔ بیشک میرے ساتھ میرے ہم خیال ساتھی ہوں اورمیں ان کو تیرے پاس لانا چاہتا ہوں ۔ تب توان کو (کھانا) مول دینا اوریہ تیری طرف سے نیک کام ہوگا اورہم تیرے پاس اپنے ہتھیار گرو کرینگے جو کہ کافی ضمانت ہیں۔ سلکان چاہتا تھا کہ جب وہ ہتھیار لائیں تو ابن الاشرف قبول کرنے سے انکار نہ کرے۔ اس نے کہا بیشک ہتھیاروں میں ضمانت ہے۔ سلکان اپنے ساتھیوں کے پاس واپس گیا اور ان کو خبردی اورکہا کہ اپنے ہتھیار لاؤ اورپھر چلے جاؤ اورپھر میرے پاس جمع ہوجانا ۔ چنانچہ وہ سب رسول اللہ کے گھر پر جمع ہوئے ۔۔۔ رسول اللہ نے خاردار درختوں کے کھیت تک ان کے ساتھ قدم رنجہ فرمایا۔ پھر آنحضرت نے ان کو رخصت کیا اور فرمایا خدا کے نام سے جاؤ۔اے خدا ان کی مدد کر۔ پھر رسول اللہ گھر کو لوٹ گئے اور یہ چاندنی رات کا

---

[1] جلد دوم صفحہ ۴۳،۷ ۴۷۔ نیز ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۵۴، ۵۵، اور روضۃ الصفا جلد دوم صفحات ۱۰۰ سے ۱۰۲ تک۔

[2] یعنی جو اشعار کعب ابن الاشرف نے کہے تھے۔

[3] حضرت محمد۔

واقعہ ہے۔ وہ روانہ ہوئے یہاں تک کہ ابن الاشرف کے قلعہ تک پہنچے۔ ابونائلہ نے اس کو پکارا۔ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ اپنے جُبہ ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی نے اس کا دامن پکڑ کر کہا تو جنگی مرد ہے اور جنگی مرد اس وقت نیچے نہیں جاتے۔ اس نے کہا یقیناً یہ ابونائلہ ہے۔ اگر وہ مجھے سوتا پائے تو مجھ کو نہیں جگائیگا۔ وہ کہنے لگی بخدا بیشک اس کی آواز میں مجھے بدی محسوس ہوتی ہے۔ کعب نے اس سے کہا اگر وہ لڑکا مجھے نیزہ مارنے کے لئے بھی بلائے تو میں انکار نہیں کرونگا۔ وہ نیچے اتر گیا اور کچھ دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔ پھر (ابونائلہ نے) کہا ابن الاشرف کیا تو رضامند ہے کہ ہم سب عجوز کی گھاٹی تک چلیں اوراس رات کا بقیہ وہاں گفتگو میں بسر کریں ؟ (ابن الاشرف نے )کہا اگر تم چاہتے ہو تو بہتر۔لہذا وہ باہم باتیں کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ کچھ دیر تک وہ چلتے رہے۔ تب البتہ ابونائلہ نے اسکے (ابن الاشرف کے) سرکے بالوں میں اپنا ہاتھ ڈالا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ سونگھ کر کہا میں نے کبھی اس کو ایسا معطر نہیں پایا جیسا کہ آج کی رات۔ پھر وہ اور کچھ دیر تک چلتا رہا اور پھر ویسا ہی کیا یہاں تک کہ کعب کو اعتماد ہوگیا۔ پھر وہ کچھ دیر تک چلتا رہا اور پھر ویسا ہی کیا۔اس نے اس کے (ابن الاشراف کے) سر کے بال پکڑلئے اور کہا خدا کے دشمن کو مارو۔ چنانچہ انہوں نے اسے مارا۔ ان کی تلواریں آپس میں ٹکرا گئیں اور بالکل کارگر نہ ہوئیں۔ محمد ابن مسلمہ نے کہا تب مجھ کو میری لمبی تلوار کا خیال آیا۔ جب میں نے دیکھا کہ ہماری تلواریں کچھ کارگر نہیں ہوئیں۔ میں نے وہ ہاتھ میں لی۔ خدا کا دشمن ایسا زور سے چلایا کہ ہمارے آس پاس کوئی ایسا قلعہ نہ رہا جس پر آگ نہ جلائی گئی۔ تب میں نے اپنی تلوار اس کے پیٹ میں ماری اوراسے دبایا یہاں تک کہ اس کی ناف تک پہنچ گئی اور خدا کا دشمن گر پڑا۔

اورحارث ابن اوس ابن معاذ کو اس کے سر پر یا پاؤں پر ایک زخم لگ گیا۔ ہماری تلواروں میں سے ایک اسے لگ گئی۔ ہم وہاں سے چل نکلے یہاں تک کہ بنی امیہ ابن زید سے گذرگئے پھر بنی قریظہ سے یہاں تک کہ حرۃ العریض تک پہنچے اورہمارے ساتھی حارث ابن اوس کے سبب سے ہمیں دیر ہوگئی۔ خون بہ جانے سے وہ بہت کمزور ہوگیا تھا۔ اس کے سبب سے ہم کچھ دیر تک ٹھہر گئے ۔ پھر ایک شخص جوہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا ہمارے پاس آپہنچا۔ پس ہم نے اسے (حارث کو) ابن اوس کے سبب سے ہمیں دیر ہوگئی ۔ خون بہہ جانے سے وہ بہت کمزور ہوگیا تھا۔ اس کے سبب سے ہم کچھ دیر تک ٹھہر گئے ۔ پھر ایک شخص جو ہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا ہمارے پاس آپہنچا۔ پس ہم نے اسے (حارث کو) اٹھالیا اور رات کے آخر ہونے پر رسول اللہ کے پاس لائے۔ آنحضرت نماز میں کھڑے تھے۔ ہم نے ان کو سلام کیا۔ وہ ہمارے پاس باہر نکل آئے۔ ہم نے ان کو خدا کے دشمن کو قتل کرنے کی خبر دی۔ انہوں نے ہمارے ساتھی کے زخم پر تھوکا اورواپس چلے گئے اورہم اپنے لوگوں کی طرف لوٹ آئے"۔

محیصہ اور حویصہ کی کہانی سے بھی پتہ لگتا ہے کہ کس کی تحریک سے ایک اور خون کیا گیا اوراس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ میں کس طرح سے بعض لوگوں کو مسلمان بنایا گیا۔چنانچہ ابن ہشام[1] ابن اسحاق سے یوں نقل کرتاہے " رسول اللہ نے فرمایا یہودیوں میں سے جس مرد پر تم غالب آؤ اس کو قتل کرو۔ چنانچہ محیصہ[2] ابن مسعود نے ایک یہودی سوداگر ابن سبینہ[1] پر حملہ

---

[1] جلد دوم ۴۷، ۵۷، ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۵۴، ۵۵۔

[2] ابن ہشام کے حاشیہ کے مطابق اس نام کا تلفظ محیصہ بھی ہے۔

کرکے اسے قتل کر ڈالا- حویصہ ابن مسعود ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا- وہ محیصہ سے بڑا تھا- جب اس نے (محیصہ نے ) اس کو (ابن سبینہ کو) مارڈالا تو حویصہ اس کو مارنے اورکہنے لگا اوخدا کے دشمن کیا تونے اس کو قتل کر ڈالا؟ بخدا یقیناً تونے اس کے مال سے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے ایسا کیاہے- محیصہ نے (یہ کہانی بتاتے وقت) یوں بیان کیا- میں نے کہا بخدا جس نے مجھ کو اسے قتل کرنے کا حکم دیا اگر وہ تجھے قتل کرنے کا حکم دیتا تو یقیناً میں تیرا سر قلم کردیتا- اس نے کہا بخدا یہ حویصہ کے اسلام کی طرف مائل ہونے کا شروع تھا- اس نے کہا اللہ! اگر محمد تجھ کومجھے قتل کرنے کا حکم دے تو کیا تو فی الحقیقت مجھے قتل کر ڈالے؟ (محیصہ نے) کہا بخدا اگروہ مجھ کو تیرا سر کاٹنے کا حکم دیتا تومیں ضرور کاٹ ڈالتا- (حویصہ نے) کہا بخدا اس دین نے تجھ میں بڑا کام کیا ہے-لہذا حویصہ مسلمان ہوگیا"- ابن اسحاق کہتا ہے کہ یہ حکایت مجھ کو بنی حارث کے ایک آدمی نے سنائی اوراس نے محیصہ کی بیٹی سے سنی تھی اور محیصہ کی بیٹی نے اپنے باپ سے سنی تھی-

حویصہ کے مسلمان ہونے کا بیان اس سے خفیف سے اختلاف کے ساتھ ابن ہشام [2] نے خود کسی اور سے سن کر لکھاہے لیکن اس مندرجہ بالا بیان سے بہت کچھ ملتا جلتاہے اوراس سے بھی یہی ظاہر ہوتاہے کہ آنحضرت کے حکم سے محیصہ نے کسی کو قتل کر ڈالا اور حویصہ خوف ودہشت کے مارے مسلمان ہوگیا-

---

[1] ابن ہشام کے بیان کے موافق اس نام کا تلفظ شنینہ بھی ہے-

[2] جلد دوم صفحہ ۷۵

ابن اسحاق [3] نے جو سلام ابن ابی الحقیق کے قتل کا بیان لکھاہے اس سے بھی ظاہر ہوتاہے کہ حضرت محمد نے اسی قسم کے ایک اور خون کی اجازت دی- وہ لکھتاہے کہ انصار میں سے نبی اوراس بنی خزرج میں بڑی رقابت و تصاولت تھی- وہ دونوں فریق اس کوشش میں رہتے تھے کہ دوسرا فریق اسلام اور حضرت محمد کی حمایت میں سبقت نہ لے جائے- چنانچہ وہ کہتا ہے کہ " جب بنی اوس نے رسول اللہ کے دشمن کعب ابن الاشرف کو قتل کر ڈالا تو بنی خزرج نے کہا- بخدا وہ اس امر میں ہر گز ہم سے سبقت نہ لے جائینگے- پس انہو ں نے باہم مشورہ کی کہ کعب ابن الاشرف کی طرح کون شخص رسول اللہ کا دشمن ہے؟ ان کو ابن ابی الحقیق یادآیا اوروہ خیبر میں تھا- لہذا انہوں نے رسول اللہ سے اس کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی جو آنحضرت نے ان کو عنایت فرمادی چنانچہ بنی خزرج میں سے عبداللہ ابن عتیک اور مسعر ابن سنان اور عبداللہ ابن انیس اورابو قتادہ اورحارث ابن ربعی الخزاعی جوان کا حلیف تھا پانچ آدمی اس کی طرف روانہ ہوئے اور رسول اللہ نے عبداللہ ابن عتیک کوان کا سردار مقرر کیا اورکہا کہ کسی بچے یا عورت کو قتل نہ کرنا- پس وہ چلتے چلتے خیبر پہنچے-وہ رات کے وقت ابن ابی الحقیق کے گاؤں میں وارد ہوئے- وہ اس گاؤں میں جس گھر کے پاس پہنچے اس کا دروازہ باہر سے بند کردیا- اور(ابن ابی الحقیق) اپنے بالاخانہ میں تھا جس کی طرف ایک سیڑھی جاتی تھی- پس وہ اس سیڑھی سے چڑھ گئے یہاں تک کہ اس کے دروازے پر جاکھڑے ہوئے- انہوں نے اس کے پاس اندر جانے کی اجازت مانگی- اس کی بیوی ان کے پاس باہر آئی- وہ کہنے لگی

---

[3] سیرۃ الرسول جلد دوم صفحہ ۱۶۲ ، ۱۶۳ - نیز دیکھوابن اثیر جلد دوم صفحہ ۵۵، ۵۶، روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳، مشکواۃ صفحہ ۵۲۳، ۵۲۴، یہ مقتول ابورافع کے نام سے بھی مشہور ہے-

تم کون ہو؟ انہوں نے کہا ہم عرب ہیں اور غلہ ڈھونڈتے ہیں ۔ وہ کہنے لگی تمہارا دوست اندر رہے اس کے پاس جاؤ۔ جب اس کے پاس اندر گئے تو ہم نے دروازہ بند کرلیا[1] کہ مبادا اگر ہم میں کش مکش ہو تو اس کی بیوی بیچ میں نہ آجائے لہذا اس کی بیوی چلائی اور ہم پر چیخنے لگی۔ ہم نے ناگہاں اس پر اپنی تلواروں کے ساتھ حملہ کیا (وہ اپنے بستر پر تھا) اور بخدا رات کی تاریکی میں اس کے چونہ کے سوا کسی چیز سے ہم کو اس کا پتہ نہ ملتا تھا۔ (وہ ایسا نظر آتا تھا) گویا مصری ململ بچھی تھی اور جب اس کی بیوی ہم پر چلائی تو ہم میں سے ایک مرد[2] نے اس کے خلاف تلوار اٹھائی ۔ پھر اس کو رسول اللہ کا منع کرنا یاد آگیا۔ لہذا اس کا ہاتھ نیچے ہو گیا۔ اگر ایسا (حکم) نہ ہوتا تو یقیناً ہم اس رات اس عورت کو مار ڈالتے ۔ پس جب اپنی تلواروں سے اس پر وار کئے تو عبداللہ ابن انیس نے اپنی تلوار سے اسے دبایا یہاں تک کہ اس کے پیٹ میں سے پار ہو گئی -----۔ ہم وہاں سے باہر نکلے گئے ۔ عبداللہ ابن عتیک کی نظر خراب تھی۔ وہ سیڑھی پر سے گر پڑا۔ اور اس کے ہاتھ میں سخت موچ آگئی اور ابن ہشام کے بیان کے مطابق اس کے پاؤں میں۔ ہم اس کو اٹھا کر لے آئے یہاں تک کہ ہم ان کے چشموں کے ایک نالے کے پاس پہنچے اور اس میں داخل ہوئے اور انہوں نے آگ جلائی اور ہماری تلاش میں ہر طرف دوڑے یہاں تک کہ جب مایوس ہو گئے تو اپنے دوست کی طرف لوٹ گئے اور وہ اس کے گرداگرد کھڑے ہو گئے جب کہ وہ ان کے درمیان میں مر گیا---۔ ہم اپنے ساتھی کو اٹھا کر رسول اللہ کے پاس پہنچے اور خدا کے دشمن کو قتل کرنے کی خبر دی اور اس کے سامنے ہم آپس میں جھگڑنے

---

[1] اور اس کی بیوی باہر رہ گئی۔

[2] یقیناً بیان کرنے والا خود۔

لگے۔ ہر ایک دعویٰ کرتا تھا کہ میں نے قتل کیا۔ لہذا رسول اللہ نے کہا اپنی تلواریں لاؤ۔ ہم انہیں ان کے پاس لائے ۔ آنحضرت نے ان پر نظر کی اور کہا یقیناً اس عبداللہ ابن انیس کی تلوار نے اسے قتل کیا ہے۔ اس پر میں غذا کے نشان دیکھتا ہوں۔"

اس بیان میں ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت نے اس ایک خاص موقع پر عورتوں کو قتل کرنے سے منع کیا لیکن یہ ہمیشہ کا دستور نہیں تھا چنانچہ عصماء کے انجام کے قصہ سے صاف عیاں[3] ہے۔ ابن اسحاق نے اس کے اور ایک نہایت بوڑھے آدمی کے قتل کا قصہ حسب ذیل لکھا ہے ابوعفک ایک صد سالہ بوڑھے نے حضرت محمد کے خلاف کچھ شعر کہے تھے" ۔لہذا (ابن اسحاق[4] بیان کرتا ہے) رسول اللہ نے کہا اس بدکار کے معاملہ میں میرے لئے کون ہے؟ لہذا سالمہ ابن عمیر بنی عمرو بن عوف کے بھائی نے جورو والوں میں سے تھا جا کر اسے قتل کر ڈالا"۔

عصما بنت مروان ایک شاعرہ تھی جس نے اشعار میں حضرت محمد کی ہجو لکھی تھی۔ اس کے انجام کے بارے ابن اسحاق[5] یوں لکھتا ہے " جب ابوعفک قتل کیا گیا تو وہ ایسا ظاہر کرنے لگی کہ مسلمان ہو گئی ہے۔ وہ بنی خطامہ کے ایک مرد یزید بن زید کی بیوی تھی---۔ رسول اللہ نے کہا کیا میں مروان کی بیٹی سے اپنے لئے اطمینان حاصل نہیں کروں گا؟ عمیر ابن عدی خطمی نے قریب

---

[3] ابن ہشام نے سیرۃ الرسول کی دوسری جلد کے صفحہ ۲۱۸ پر لکھا ہے کہ حضرت محمد نے مکہ میں دو غلام لڑکیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا جنہوں نے آنحضرت کی ہجو کی تھی۔ ایک بچ گئی لیکن ایک اور تیسری سارہ نامی تھوڑی دیر بعد قتل کی گئی

[4] سیرۃ الرسول جلد سوم صفحہ ۹۰۔

[5] سیرۃ الرسول جلد سوم صفحہ ۹۰، ۹۱

ہونے کے سبب سے اس بات کو رسول اللہ کے کلام سے سن لیا۔ چنانچہ رات ہوئی تو رات کے وقت عصما کے گھر میں جا گھسا اور اس کو قتل کرڈالا۔ پھر صبح کے وقت وہ رسول اللہ کے ساتھ تھا اور ان سے کہنے لگا یا رسول اللہ یقیناً میں نے اس کو قتل کردیا ہے۔ تب حضرت محمد نے کہا اے عمیر تونے اللہ اور اس کے رسول کی مدد کی ہے۔ عمیر نے کہا یا رسول اللہ کیا اس کے سبب سے میرے لئے کچھ (خطرہ) ہے؟ آنحضرت نے کہا اس کے لئے دو بکریاں بھی ایک دوسری کو ٹکر نہیں مارینگی۔ پس عمیر اپنے لوگوں کی طرف چلا گیا۔ اس دن مروان کی بیٹی کے سبب سے بنی خطامہ میں بڑی ہل چل برپا ہو گئی۔ اس دن اس کے بیٹوں میں سے پانچ آدمی تھے۔ جب عمیر ابن عدی رسول اللہ کے پاس ان کے پاس آیا تو کہنے لگا ای بنی خطامہ بنتِ مروان کو میں نے قتل کیا ہے۔ کیا تم سب مل کر مجھ سے بدلہ لوگے؟ ---- اس روز پہلے پہل بنی خطامہ کے گھروں میں اسلام کی عزت ہوئی کیونکہ ان میں سے کوئی (اس وقت تک) مسلمان ہوتا تھا اسلام پر اپنے ایمان کا اظہار نہیں کرتا تھا اور بنی خطامہ میں سے اسلام قبول کرنے والا پہلا شخص عمیر ابن عدی تھا------- اور بنی خطامہ کے بعض آدمی اس روز مسلمان ہوئے جس روز بنتِ مروان قتل کی گئی جب انہوں نے اسلام کی عظمت کو دیکھا"۔

ایک اور بیان سے اس قتل کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عمیر اندھا تھا اور پہلے وہ عصما کا شوہر بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رات کے وقت اس کمرہ میں جا گھسا جہاں عصما اپنے ایک شیر خوار بچے کے ساتھ سوتی تھی۔ آہستہ سے بچے کو ہٹا کر اس نے اپنی تلوار اس کے جسم میں داخل کردی اور اس کو آرپار چھید ڈالا۔ حضرت محمد نے دوسرے روز اس قتل کی خبر سنی تو مسجد میں عمیر کی طرف اشارہ کرکے لوگوں سے کہا اس آدمی نے اللہ اور اس کے رسول کے لئے بڑا کام کیا ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ابوالحقیق کے قتل سے تھوڑا ہی عرصہ پیشتر ضعیفہ امُ کرفا زید کے حکم سے کیسی بے رحم سے قتل کی گئی تھی۔اس کی ٹانگیں اونٹوں سے باندھ کر ان کی مخالف اطراف میں ہانکا یہاں تک کہ اس بیچاری کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ۔ جب زید واپس آیا تو آنحضرت نے بڑے تپاک سے اس کو مبارک باد دی اور اس بیرحمی کے لئے اسے بالکل ملامت نہ کی۔

ابن ہشام [1] بتاتا ہے کہ حضرت محمد نے عمرو ابن امیہ اور جبار ابن صخا کو ابوسفیان ابن حرف کے قتل کے لئے مدینہ سے مکہ بھیجا۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوئے کیونکہ ان کا پتہ لگ گیا اور ان کو اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنا پڑا۔ لیکن یہ حضرت محمد کی سوانح عمری لکھنے والا صاف طور سے تسلیم کرتا ہے کہ آنحضرت اس سازش میں شریک تھے۔ اس کا بیان نقل کرنے کے لئے بہت ہی طویل ہے لیکن اس سے کئی بزدلی کے قتل ظاہر ہوتے ہیں جو آنحضرت کے دونوں مسلمان قاصدوں نے کئے جبکہ وہ اپنے پیچھا کرنے والوں سے بچنے کی کوشش کررہے تھے۔

تمام اہلِ علم خوب جانتے ہیں کہ مشہور ومعتمد علیہ مسلمان مفسرین ومصنفین کی تصانیف سے حضرت محمد کے اپنے دشمنوں کے ساتھ سلوک کی اور بہت سی مثالیں [2] پیش کی جاسکتی ہیں لیکن جو کچھ اس مضمون پر ہم کہہ چکے ہیں ہمارے معزز ناظرین اسی پر اکتفا کرینگے۔ ہم آنحضرت کے ان افعال کی

---

[1] جلد سوم صفحہ ۸۹، ۹۰-ابن اثیر جلد دوم صفحہ ٦٣، ٦٤-

[2] مثلاً مخیرق کا قتل- ابن ہشام جلد دوم صفحہ ۸۷

تفسیر وتاویل نہیں کرتے اور نہ ان کے بارے میں کوئی اپنی رائے پیش کرتے ہیں لیکن ہم مسلمان احباب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ خوب غوروفکر سے کام لیں اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ سوچیں کہ وہ ذیل کے سوال کا کیا جواب دینگے:۔

اگر حضرت محمد نبوت کا دعویٰ نہ کرتے۔ اگر زمانہ جاہلیت کے دیگر عربوں کی طرح بُت پرست ہوتے۔ (اگران کو رحیم ورحمنٰ اور قدوس اللہ تعالیٰ کی مرضی کا کچھ علم نہ ہوتا)۔ لیکن فقط تیمور رلنگ کی طرح بڑے بہادر جنگی مرد ہوتے اور فقط اسی بات کی کوشش کرتے کہ اپنے آپ کو دنیامیں صاحبِ قدرت بنائیں اور خوشبواور عورتوں سے محفوظ ہوں تو دینی رسم ورواج اوراپنے کاتبوں سے قرآن لکھوانے کے سوا اور کونسی بات میں ان کا چال چلن اس سے مختلف ہوتا جو کہ رسول اللہ ہونے کے دعویٰ کے باوجود فی الحقیقت ہوا ہے؟ یا یوں کہیں کہ اخلاقی معاملات میں آنحضرت کا چال چلن کن معنوں میں ان فاتحین کے چل چلن سے بہتر تھا جو فقط اسی دنیا کی کامیابی اور لذاتِ نفسانی کے حصول میں ساعی وکوشاں رہتے ہیں ؟ جن معاملات پر ہم غور کرتے چلے آئے ہیں کیا ان میں حضرت محمد کا چال چلن پاکدامنی وخطا بخشی اور حلم ورحم اور نیکی میں ایسا ہے کہ اس سے آنحضرت کے من جانب اللہ وخاتم النبین وختم المرسلین ہونے کا ثبوت ملتا ہے؟ یا کیا یہ ضروری بات ہے کہ باوجود آنحضرت کے ایسے چال چلن کے آنحضرت کے دعویٰ کو سنتے ہی مان لیں؟

۳۔ جس طور سے حضرت محمد پر وحی کا نزول ہوتا تھا اس کا مشہور مورخین اسلام نے ذکر کیا ہے اوران احادیث میں بھی بیانات پائے جاتے ہیں جو سنی وشیعہ دونوں کے نزدیک قابلِ اعتماد ہیں۔ چنانچہ ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن اثیر، حسین ابن محمد (اپنی خامس ہیں)اور ترکی مصنف علی حلبی وغیرہ نے اس مضمون پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس مضمون پر سب سے زیادہ قابلِ قدر احادیث کا مجموعہ مشکواۃ المصابیح میں پایا جاتا ہے (کتاب الفطن، باب البعث وبدائع الوحی) صفحہ ۵۱۳،۵۱۶ تک۔

لکھا ہے کہ چالیس ۴۰ سال کی عمر میں آنحضرت کو رسالت عطا ہوئی اور پہلی بلاہٹ اس وقت آئی جب آنحضرت مکہ کے نزدیک کوہِ حرا کی ایک غار میں خدیجہ کے ساتھ عزلت گزیں تھے۔ حضرت محمد نے خیال کیا کہ حضرت جبرائیل نے آپ پرظاہر ہو کرکہا اقرا باسم ربک آنحضرت کانپتے اور تھرتھراتے ہوئے خدیجہ کے پاس آئے اور بلند آواز سے کہنے لگا " مجھے چھپالو! انہوں نے آنحضرت کو کپڑوں سے چھپالیا جب تک کہ آپ ہوش میں نہ آئے۔ آنحضرت پر ضرور کسی قسم کی بیہوشی یا غشی طاری ہوگئی تھی کیونکہ انہوں نے ہوش[1] میں لانے کے لئے پانی کے چھینٹے دئے۔ حضرت محمد کے سوانح نویس لکھتے ہیں کہ خدیجہ نے ایک آزمائش سے دریافت کیا کہ جس روح کو دیکھنے کا آنحضرت نے اسے یقین دلایا وہ شیطان تو نہ تھا۔ اس آزمائش سے وہ نتیجہ کی قائل ہوگئی۔ لیکن خود حضرت محمد کے دل میں بہت سے شکوک تھے اور سخت بے چینی تھی۔ اس وقت جو آنحضرت کے دل کی حالت تھی اس کے بارے میں احادیث کے مطابق آنحضرت نے خود یوں کہا ہے" میں اپنے آپ کو ایک کھڑے چٹان سے نیچے گرانا چاہتا تھا"۔ اس کے بعد پھر ایک وقفہ تھا جس کی رازی کے باب میں احادیث میں اختلاف ہے۔ الذہری کہتا ہے" کچھ عرصہ تک رسول اللہ کے پاس

[1] ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۱۷۔

وحی کا آنا بند ہوگیا۔ اس لئے اسے بہت رنج ہوا اور سویرے اٹھکر پہاڑوں کی چوٹیوں پر جانے لگا تاکہ اپنے تئیں اس پر سے نیچے گرادے اور جب کبھی وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا اس پر جبرائیل ظاہر ہوا"۔ البخاری کا بیان بھی بہت کچھ ایسا ہی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے"۔ نبی[1] اکثر صبح کے وقت اس قدر رنجیدہ ہوتا تھا کہ شاید وہ پہاڑ کی چوٹی پر سے اپنے تئیں نیچے گرادیتا۔ لہذا جب کبھی وہ اپنے تئیں نیچے گرانے کے لئے کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا اس کو جبرائیل نظر آیا"۔

پھر اس کے بعد کے زمانہ میں بھی جب کبھی آنحضرت پر بیہوشی یا غشی طاری ہوجاتی تھی جیسی کہ اس وقت ہوئی تھی جب آپ نے پہلی مرتبہ وحی کا کلام سننے کا خیال کیا تھا توجولوگ آپ کے پاس ہوتے تھے وہ بعض جسمانی علامات کو دیکھ کر کچھ نئی آیات قرآنی کوسننے کے امیدوار ہوجاتے تھے۔ حضرت عائشہ[2] نے بیان کیاہے کہ جب حضرت محمد سے پوچھا گیا کہ آپ کے پاس وحی کا آنا کس طور سے ہوتا ہے توآپ نے جواب دیا" بعض اوقات مجھے گھنٹے کی سی آواز سنائی دیتی ہے اور مجھے بہت سخت معلوم ہوتی ہے ۔وہ آواز موقوف ہوجاتی ہے اور مجھے یاد آجاتاہے کہ اس نے کیاکہا تھا اور بعض اوقات فرشتہ آدمی کی صورت میں مجھ پر ظاہر ہوتا ہے اور مجھ سے باتیں کرتاہے اور جو کچھ وہ کہتاہے میں یاد رکھتا ہوں"۔ عائشہ خود کہتی ہے" یقیناً میں نے اسے دیکھا جب نہایت جاڑے کے دن اس پر وحی کا نزول ہوتا ہے۔ اس کی پیشانی سے بہت پسینہ بہتا ہے

[1] مشکواۃ صفحہ ۵۱۴۔ نیز دیکھو ترکی کتاب مراۃ کائنات جلد اول صفحہ ۴۰۹۔
[2] مشکواۃ صفحہ ۵۱۴۔

"۔ مسلم[3] ذیل کی احادیث بیان کرتا ہے" جب کبھی اس پر وحی کا نزول ہوتا تھا نبی کواس سے تکلیف ہوتی تھی اوراس کا چہرہ متغیر ہوجاتا تھا"۔

ابن اسحاق بیان کرتاہے کہ اس سے پیشتر کہ آنحضرت پر وحی کا نزول شروع ہوا رشتہ دار خیال کرتے تھے کہ آنحضرت کو بد نظری کا آسیب ہے اورجب وحی کا نزول شروع ہوا تو قریباً اسی بیماری نے پھر عود کیا۔شاید ہم محدثین کے بیانات سے دریافت کرسکتےہیں کہ یہ بیماری کیا تھی۔ علی حلبی اپنی ترکی کتاب انسان العیون میں بیان کرتاہے کہ بہت سے لوگوں نے کہا کہ آمنہ حضرت محمد کی والدہ آنحضرت کو بد نظری کی تاثیر سے بچانے کے لئے ایک تعویذ کا استعمال کرتی تھیں۔ عمروابن شرجیل کی روایت سے بیان کیا گیاہے کہ حضرت محمد نے خدیجہ سےکہا" جب میں اکیلا تھا میں نے ایک آواز سنی جوکہتی تھی اومحمد! اومحمد! " یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ آنحضرت نےکہا" مجھے اندیشہ ہے کہ میں کہیں جادو گر نہ بن جاؤں۔ کوئی مجھے جنوں کا پیرو نہ کہہ دے "۔پھرکہا" مجھےاندیشہ ہے کہ کہیں مجھ میں جنون نہ ہو"۔ بہت دیر تک کانپنے اور تھراتھرانے اورآنکھیں بند کرنے کے بعد آپ پر غشی سی طاری ہوجایا کرتی تھی۔ چہرہ کف آلودہ ہوجاتا تھا اور اونٹ کی طرح غرآتے تھے۔ ابوھریرہ بیان کرتاہے کہ جب رسول اللہ پر وحی کا نزول ہوتا تھا توجب تک وحی تمام نہ ہوکوئی اس پر نظر نہیں کرسکتا تھا حدیث میں مرقوم ہے کہ اس کو (نزول وحی سے) بہت تکلیف ہوتی تھی اوراس کا چہرہ کف آلودہ ہوجاتا تھا۔آنکھیں بند ہوجاتی تھیں اوراس کا غرانا شاید جوان اونٹ کے غرانے کی مانند ہوتا تھا۔ عمر

[3] مشکواۃ صفحہ ۵۱۴۔

ابن الخطاب کہتا ہے " جب رسول اللہ پر وحی کا نزول ہوتا تھا تو اس کے چہرے
کے پاس شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سنائی دیتی تھی"۔

پھر ترکی کتاب مراۃ کائنات میں بھی کچھ ایسا ہی بیان ہے کہ جب وحی
کا نزول تہدید وتنبیہ کے پیغام کے ساتھ ہوتا تھا تو گھنٹے کی سی ہولناک آواز اس
کے ساتھ ہوتی تھی۔۔۔ ابوھریرہ کی روایت سے بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب
رسول اللہ پر وحی کا نزول ہوتا تھا تو ان کے سر مبارک کو حنا سے دھوتے تھے
کیونکہ اس سے سر درد شروع ہوجاتا تھا[1]۔

علی حلبی نے انسان العیون میں یوں لکھا ہے " زید ابن ثابت بیان
کرتا ہے کہ جب نبی پر وحی کا نزول ہوتا تھا تو وہ بہت بھاری ہوجاتا تھا۔ ایک
مرتبہ اس کی ٹانگ پر لگی اور بخدا کوئی ٹانگ ایسی بھاری نہیں جیسی کہ رسول اللہ
کی تھی۔ بعض اوقات ایسے موقع پر وحی کا نزول ہوتا تھا جب وہ اونٹ پر سوار
ہوتا تھا۔ اونٹ ایسا تھرتھراتا کہ گویا گرنے کو ہے اور عموماً دوزانو ہوجاتا
تھا۔۔۔ جتنی مرتبہ نبی پر وحی کا نزول ہوتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روح
سلب ہورہی ہے کیونکہ ہمیشہ اس پر غشی طاری ہوجاتی تھی اور ایسا نظر آتا تھا
جیسا کوئی نشہ میں ہو"۔

یہ عجیب وغریب نظارے حضرت محمد کے دعویٰ نبوت سے تھوڑا ہی
عرصہ پیشتر شروع نہیں ہوئے۔ آنحضرت کے بچپن کے متعلق ہم فقط چند
باتیں جانتے ہیں لیکن ان چند باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب آپ بہت ہی
چھوٹے لڑکے تھے اور اپنے پرورش کرنے والوں کے ساتھ بیابان میں رہتے تھے

[1] مراۃ کائنات جلد اول صفحہ ۱۱۴ پر بھی منقول ہے۔

تب بھی کچھ اسی قسم کی بات وقوع میں آئی تھی۔ مختلف راویوں نے اس کہانی
کو مختلف طور پر بیان کیا ہے لیکن مسلم کا بیان انس کی روایت کردہ حدیث کے
مطابق یوں مرقوم ہے " جب رسول اللہ دیگر لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے
تو جبرائیل ان کے پاس آیا اور ان کو زمین پر گرا کر ان کے دل کو چیرا اور اس
میں سے منجمد خون کا ایک قطرہ نکال کر کہا یہ تجھ میں شیطان کا حصہ ہے۔ تب
اس نے اسے (دل کو) ایک زرین برتن میں آبِ زمزم سے دھویا۔ پھر اس نے
اسے سی کر اس کی جگہ (حضرت کے سینہ میں) واپس رکھ دیا اور لڑکے دوڑتے
ہوئے ان کی ماں (یعنی دودھ پلانے والی حلیمہ) کے پاس آئے اور کہنے لگے
تحقیق محمد مار ڈالا گیا ہے۔ لہذا وہ انہیں دیکھنے کو نکلے اور ان کا رنگ بدلاہوا
پایا"۔ انس نے بیان کیا" میں ان کے سینہ پر سوئی کا نشان دیکھا کرتا تھا"۔
اس حدیث پر مشکوۃ کے حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم دو اور موقعوں پر
حضرت کا سینہ کھولا گیا تھا یعنی شبِ معراج میں اور جب غار حرا میں جبرائیل
آنحضرت کے پاس آیا تھا۔ باستثنایِ واقعہ معراج ہم دیکھتے ہیں کہ جو کچھ
آنحضرت کے بچپن میں واقع ہوا اس میں اور بعد کے نزولِ وحی میں بہت بڑی
مشابہت ہے۔

ابن ہشام سیرۃ الرسول[2] میں لکھتا ہے کہ حلیمہ کے شوہر نے خیال
کیا کہ چھوٹے محمد پر کوئی سخت حادثہ گذرنے والا تھا چنانچہ اس نے حلیمہ سے کہا
" حلیمہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس لڑکے کو کوئی بیماری لگ گئی ہے لہذا اس کے
ظاہر ہونے سے پیشتر اس کو اس کے لوگوں کے پاس پہنچا دو"۔ جب حلیمہ نے

[2] جلد اول صفحہ ۵۶

آپ کو آپ کی والدہ آمنہ کے حوالہ کیا تو اس نے کہا "پھر کیا تو ڈرتی ہے کہ شیطان اس پر آگیا ہے"؟ حلیمہ نے اپنے اس اندیشہ کا اقرار کیا۔

اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ جس نظارے کا احادیث میں ذکر ہے وہ فی الحقیقت حضرت محمد کے پاس جبرائیل کا آنا اور وحی کا نزول تھا؟ مورخین ہم کو بتاتے ہیں کہ جلیل القدر رومی سپہ سالار جولیس سیزر۔ پطرس اعظم شہنشاہِ روس اور نپولین بوناپارٹ اول شہنشاہِ فرانس اور دیگر بڑے آدمیوں خصوصاً جنگی مردوں میں یہی علامات تھیں لیکن وہ انبیاء اللہ اور رسل من اللہ نہیں تھے ۔ جو لوگ ان کی خدمت کرتے تھے ان کا یہ خیال تھا کہ وہ سخت امراض میں مبتلا ہیں۔

یقیناً ہمارے مسلمان ناظرین نے علمِ طب کو مطالعہ کیا ہے اور اس کی تحصیل سے سرفراز ہیں اور بعض کے دوست واحباب حاذق اطبا ہیں لہذا مناسب ہے کہ یہ دریافت کریں کہ آیا کوئی ایسی بیماری ہے یا نہیں جو عموماً بچپن میں شروع ہوتی ہے اور جس کی علامات بعض یا سب یہ ہیں کہ بیمار عجیب بے ربط آوازوں سے چیختا ہے۔ اچانک زمین پر گرجاتا ہے۔ زرد ہوجاتا ہے اور کبھی ارغوانی ہوجاتاہے۔ جسم شدت سے کانپتا ہے ۔ منہ میں کف بھر آتا ہے۔آنکھیں بند ہوجاتی ہیں اور بیمار مشرف بموت معلوم ہوتا ہے۔ وہ اکثر تیز روشنی اور تیز وگہرے رنگ دیکھتاہے ۔ اس کے کان بجنے لگتے ہیں اور بعد میں اس کو عموماً سخت دردِ سر لاحق ہوتا ہے۔ کبھی غش آنے سے پیشتر ہی اس کو صاف پتہ لگ جاتاہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ضرور ایسی بیماری ہے اور وہ شاذو کمیاب بھی نہیں ہے۔ ان اوراق کا مصنف طبیب نہیں ہے وہ لہذا بھی اوروں کے ساتھ اس امر کے متعلق کوئی رای دینے کی جرات نہیں کرسکتا۔

اب ہم اس بات کا فیصلہ اپنے ناظرین کے ہاتھ میں چھوڑتے ہیں کہ وہی خدا کی ہدایت سے یہ فیصلہ کریں کہ جو باتیں ہم نے حضرت محمد کے اعمال واخلاق اور چال چلن کے متعلق معلوم کی ہیں ان سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ فی الحقیقت نبی اللہ تھے۔ واضح ہو کہ آنحضرت کے متعلق جس قدر بیانات ہم نے نقل کئے ہیں وہ ان کے مخالفین کے نہیں بلکہ سب کے سب ہوا خواہوں اور تابعین کے اور رشتہ داروں اور ایسے لوگوں کے ہیں جو ان کے رسول اللہ اور خاتم النبین ہونے پر نہایت پختہ ایمان رکھتے ہیں۔

# ساتواں باب

## اس طریقہ کی تحقیق جس سے اسلام پہلے پہل عرب اوراس کے گردو نواح کے ممالک میں پھیلا

ابن ہشام [1] اور حضرت محمد کے دیگر سوانح نویس ووقائع نگار بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت نے چالیس سال کی عمر کو پہنچ کرمکہ میں نبوت کا دعویٰ کیا توپہلے پہل اپنے دین کی اشاعت کے لئے نرمی ومہربانی کے وسائل اختیار کئے۔اس نے اس دین کو " دین ابراہیم" کہا اوراپنی تعلیم کو زید حنیف کی تعلیم کے مطابق قرار دیا اور لوگوں کو بت پرستی سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں قائم کرنے کےلئے اپنے ذاتی رسوخ ولحاظ اور ترغیب واستدلال سے کام لیا۔آنحضرت کی بیوی خدیجہ ہی شاید سب سے پہلے آپ کی رسالت پر ایمان لائی اور جو دیگر سات شخص تھوڑاہی عرصہ بعد ایمان لائے وہ یہ تھے(۱-) زید [2] ابنِ حارث (۲) ابوبکر(۳) عثمان ابن عفان (۴) زبیر ابن العوام(۵) عبدالرحمٰن ابن عوف(۶) سعد ابن ابی وقاص اور(۷) طلحہ ابن اسحاق اور بھی بہت سے پہلے مسلمانوں کے نام درج کرتا ہے یہاں تک کہ ان میں ننھی عائشہ بھی شامل ہے۔ یہ لوگ حضرت محمد کی تعلیم کے پہلے تین سال میں پوشیدہ طور سے مسلمان بنائے گئے تھے۔آنحضرت نے اپنے چچا ابوطالب [3] کی حمایت وحفاظت کے زیر سایہ علانیہ عوام کو اسلام کی تعلیم دینا شروع کیا۔آنحضرت کی نبوت کے پانچویں [4] سال میں فقط سوالہ مسلمان ہجرت کرکے اے بی سینیا میں چلے گئے لیکن وقتاً فوقتاً اور بھی نجاشی کے دربار میں جاتے رہے یہاں تک کہ آخر کار ان کا شمار تراسی آدمیوں تک پہنچ گیا اور کچھ عورتیں اور بچے ان کے علاوہ تھے ۔ مسلمان مورخین کے اس قول کی سچائی کا کہ نجاشی خود بھی مسلمان ہوگیا تھا کوئی ثبوت نہیں ملتا کیونکہ اے بی سینیا ابتک مسیحی ملک کہلاتاہے۔ پھر توڑا عرصہ بعد مکہ میں قریباً چالیس مردوزن مسلمان موجود تھے۔ پھر لکھا ہے کہ نجران کے قریباً بیس مسیحی کعبہ میں قرآن سن کر مسلمان [5] ہوگئے ۔ لیکن یہ کہانی بمشکل ہی سچی متصور ہوسکتی ہے کیونکہ اول تو مسیحی کعبہ میں داخل نہیں ہوئے ہونگے جو اس وقت بُت پرستوں کا معبداور بتوں سے بھرا پڑا تھا۔ دوم انہوں نے اپنی کتابوں میں حضرت محمد کا ذکرکھیں ہرگز ہرگز نہیں پایا تھا جیسا کہ ابن ہشام کہتاہے۔

سرداران قریش کے ایک مجمع میں حضرت محمد نے ان کوپنی طرف کرلینے کی ایسی کوشش کی اور یقین دلایا کہ اگر دوسرے تمام معبودوں [6] کو چھوڑ کر فقط توحید الہیٰ پر ایمان لائیں تو تمام عرب وفارس پر اختیار حاصل ہوجائیگا۔آپ نے بہت سے پیرووں کے اے بی سینیا چلنے جانے کے بعد ایک مرتبہ اس سے پیشتر بھی ایسی کوشش [7] کی تھی اوریوں کہا تھا" کیا تم نے لات والعزیٰ اور منوۃ

---

[1] سیرۃ الرسول جلد اول صفحہ ۷۳ سے ۸۸ تک

[2] جواس وسیلہ سے آزاد ہوگیا۔

[3] جو کہ اس وقت مسلمان نہیں تھا۔ اس کا بعد میں مسلمان ہونا بھی یقینی نہیں ہے۔

[4] ابن ہشام جلد اول صفحہ ۱۱۱

[5] جلد اول صفحہ ۱۱۹

[6] جلد اول صفحہ ۱۳۶

[7] جلد اول صفحہ ۱۴۶

کو نہیں دیکھا ؟ یہ عالی رتبہ خوبصورت کنواریاں ہیں اور یقیناً ان کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے"۔ اہلِ قریش جو اس وقت کعبہ میں تھے یہ سن کر آنحضرت کے ساتھ نماز میں شریک ہوگئے اور اس کی خبر اے بی سینیا میں جلاوطنوں کو جا پہنچی اور وہ یہ سمجھے کہ سب اہل مکہ مسلمان ہوگئے ہیں۔ ان میں سے اکثر لوٹ آئے اور مکہ پہنچ کر انہوں نے اس خبر کو غلط پایا کیونکہ حضرت محمد نے منقولہ بالاعبارت کے آخری حصہ کو بہت جلد بالکل بدل کر ایسا بنالیا تھا جیسا کہ اب سورۃ النجم کی ۱۹ ویں آیت سے ۲۳ ویں آیت تک پایا جاتا ہے۔

بنی اوس اور بنی خزرج کے بعض آدمی جو یثوب میں رہتے تھے جو اب مدینہ کہلاتا ہے مکہ کو گئے اور وہاں حضرت محمد کا وعظ سنا۔ان میں سے ایک مسلمان ہوگیا لیکن اس نے اپنے گھر واپس پہنچ کر تھوڑا ہی عرصہ بعد وفات پائی۔ تو بھی تعلیم وہاں رفتہ رفتہ پھیلتی رہی۔ پھر چھ آدمیوں نے حضرت محمد کے پاس آکر اسلام [1] قبول کیا۔ پھر بہت جلد یہ حال ہوگیا کہ انصار کے گھروں میں سے کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں حضرت محمد کا ذکر نہ ہو۔ پہلے عہد عقبہ کے موقع پر بارہ مدنی مردوں نے حضرت محمد کو مدینہ جانے کی دعوت دی اور مدد کا وعدہ کیا۔ اس عہد سے نو مسلموں کے یہ فرائض قرار پائے کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ چوری نہ کریں۔ زنا نہ کریں۔ اپنے بچوں کو قتل نہ کریں۔ غیبت نہ کریں اور کسی مناسب بات میں حضرت محمد سے بیوفائی نہ کریں۔ اس کے عوض میں حضرت محمد نے ان کو بہشت کا وعدہ دیا بشرطیکہ وہ آنحضرت کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہیں [2]۔ بعد کو یہ عہد عہد النسا کہلایا کیونکہ اس میں لڑائی کا

[1] ابن ہشام جلد اول صفحہ ۱۵۰

[2] ابن ہشام جلد اول صفحہ ۱۵

ذکر نہیں تھا۔ مصعب ابن عمیر ان نئے مسلمانوں کو نماز کے قواعد سکھانے کے لئے مدینہ بھیجا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے اور بہت سے لوگوں کو مسلمان بنالیا جن میں سعد ابن معاذ اور اسید ابن حضیر وزبردست سردار بھی شامل تھے۔ دوسرے سال مصعب ۷۳ مسلمان مردوں اور دو مسلمانوں عورتوں کے ساتھ مدینہ سے مکہ آیا۔ دوسرے عہد عقبہ میں انہوں نے اسلام کی عظمت اور شرک کی نیستی کی غرض سے حضرت محمد کی مدد کے لئے تلواریں کھینچنے کا بھی وعدہ کیا۔ پہلے تو آنحضرت نے کہا کہ آپ تلوار چلانے کے لئے نہیں بھیجے [3] گئے تھے لیکن تھوڑا ہی عرصہ بعد آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے لئے لڑنے کی اجازت دے دی ہے اور ایمانداروں کے لئے بہشت کا وعدہ فرمایا۔ اس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ہجرت وقوع میں آئی اور قریباً تمام مکی مسلمان مدینہ چلے گئے۔ حضرت محمد وابوبکر علی [4] عرصہ قلیل کے لئے مکہ میں رہے اور پھر کسی قدر خطرہ کی حالت میں وہاں سے بچکر نکلے۔ ہم کو معلوم نہیں کہ کتنے مسلمانوں نے اپنے دین کی خاطر اپنا شہر چھوڑا۔ پھر قریباً ڈیڑھ سال کے بعد ۸۳ مہاجرین نے بدر کی لڑائی کی۔ لہذا حضرت محمد نے مکہ میں باامن وعظ و نصیحت اور تعلیم کے وسیلہ سے تیرہ سال میں شاید ایک سو سے کچھ زیادہ لوگوں کو اسلام میں داخل کیا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بعض وفات پاگئے تھے۔ مدینہ والوں کا شمار غالباً کسی قدر کم تھا اور وہ زیادہ تر دنیوی اغراض سے مسلمان ہوئے تھے۔

حضرت محمد کی وفات سے کچھ عرصہ بعد مدینہ کی مسجد میں حضرت ابوبکر نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ مکہ میں نرمی ومہربانی کے وسائل سے اسلام

[3] جلد اول صفحہ ۱۵۷۔

[4] ابن ہشام جلد اول صفحہ ۱۶۹

پھیلانے میں حضرت محمد کی کوششیں مقابلتہً ناکامیاب رہیں۔چنانچہ اس نے یول کہا[1] " محمد دس سال سے زیادہ تک اپنے لوگوں کے درمیان رہا اور ان کو اسلام کی طرف بلاتا رہا لیکن وہ لوگ باستثنایِ معدودے چند ایمان نہ لائے ۔آخر کار اللہ تعالیٰ کی مرضی سے اس نے تمہارے گھروں کو شعاعِ نور سے منور کیا اور تمہارے شہر کو اپنے جلاوطنوں کا گھر اور اپنی ہجرت کی جایِ پناہ بنالیا[2]۔

اب حضرت محمد تیرہ سال تک نرمی ومہربانی کے وسائل سے اپنے دین کی اشاعت میں کوشش کرچکے تھے۔ سب سچے نبی ایسے ہی وسائل سے لوگوں کو خدا کی طرف بلاتے رہے تھے غالباً آنحضرت ابوبکر کے ساتھ اس خیال میں متفق تھے کہ آپ کامیاب نہ ہوئے ۔آنحضرت اپنے تابعین سمیت اپنے شہر سے خارج کئے گئے تھے اوراب جلاوطنی میں اُن اقوام کے ساتھ رہتے تھے جواکثر قریش سے عداوت رکھتی تھیں۔آنحضرت نے اپنے دین میں بہت سی پرانی عربی رسوم کو قائم رکھا تھا۔مثلاً طواف اور حج کعبہ اور حجر الاسود کی تعظیم کرنا۔ آنحضرت خود اور ان کے تابعین ان فرائض کو جنگ کئے بغیر بجا نہیں لاسکتے تھے ۔علاوہ بریں انصار کو آپ نے بتادیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے لئے لڑنے کی اجازت دے دی ہے اوراب لڑائی کے بغیر انصار بھی تسلی نہیں پاسکتے تھے لہذا اب سے آنحضرت " النبی بالسیف" یعنی نبی تیغ زن بن گئے اور اس وقت سے اسلام کی مضبوط ترین وکار گردلیل تلوار ہی قرار پائی۔

اگرہم حضرت محمد اوران کے تابعین کے چال چلن پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوگا کہ اب وہ یہ خیال کرنے لگ گئے تھے کہ عہدِ عقبہ کے موضوع

[1] روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۲۲۱

[2] اسی واسطے سورہ حج ۴۰، ۴۱ اور سورہ بقرہ آیت ۲۱۵، ۲۱۷ میں جنگ کی تعلیم دی گئی۔

ومقبول اخلاقی قواعد کی پابندی ان کے لئے ضروری نہ تھی۔اب خدا ان سے فقط یہی ایک بات طلب کرتا تھا کہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور تیغ وتیرا اور خنجرو شمشیر سے قتل پر قتل کرتے رہیں۔ لہذا جو کچھ ہم ابونائلہ ومحیصہ ودیگر مسلمین کے افعال و کردار بیان کرچکے ہیں ان سب کا باعث یہی تھا پاکدامنی کے متعلق حضرت محمد کے اپنے چال چلن کی طرف نظر واشارہ کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ ہم ذرا عبدالرحمٰن کے چال چلن پر غور کریں جو لونڈیوں کےعلاوہ سولہ بیویوں سے اولاد چھوڑ کر مرا۔جب یہ شخص پہلی مرتبہ مدینہ میں پہنچا تو انصار میں سے ایک مرد سعد نامی نےاپنی دوبیویوں میں سے ایک کوجسے وہ پسند کرےطلاق دینے کا وعدہ کیا۔ عبد الرحمٰن نے خوشی سے منظور کرلیا ۔ حضرت محمد نے اس شادی کے خلاف جو کہ الہیٰ شریعت کے مطابق زناکاری[3] تھی کچھ بھی نہ کہا۔ پھر خالد ابن ولید کا چال چلن قابلِ غور ہے۔ خصوصاً جب اس نے سیریا[4] پر لشکر کشی کی تو وہ شہوت پرستی میں مشہور ہوگیا لیکن اسلام میں اس کو روکنے یاناجائز قراردینے کی کوئی بات نہ تھی بلکہ قرآن صاف طور سے کثیر الازواجی اور لونڈیاں رکھنے کی تعلیم دیتاہے اور حضرت محمد کے اپنے نمونہ سے اور مومنین اور خدا کی راہ میں لڑنے والوں کےلئے بہشت میں نفسانی خوشیوں کے وعدوں سے بھی اس کی ترغیب ملتی ہے جوان میں سے میدانِ جنگ میں مارے جاتے تھے شہید کہلاتے تھے اور یہ ایمان رکھتے تھے کہ ایسوں کے صلہ وجزا میں حورانِ بہشت استقبال کو منتظر کھڑی رہتی ہیں خواہ وہ کسی لوٹ کے

[3] متی ۵: ۳۲- ۱۹: ۹- مرقس ۱۰: ۱۱ لوقا ۱۶: ۱۸

[4] کاتب الواقدی فتوح الشام اس سے پیشتر بھی وہ اپنے طبعی میلان کا اظہار کرچکا تھا دیکھو روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۲۳۰۔

دھاوے میں مرے ہوں جس میں دوسرے لوگوں کا کامل زبردستی چھیننا چاہتے تھے۔

جونہی حضرت محمد نے لڑائی اور لوٹ کی اجازت دی اہلِ عرب گروہا گروہ آپ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔۔مدینہ پہنچ کر چند ہی مہینوں میں جیسا کہ ابن ہشام بیان کرتا ہے" بنی اوس کے چند اشخاص کے سوا مدینہ میں کوئی گھر نہ تھا جو حضرت محمد پر ایمان نہ لایا[1] ہو"۔ مہاجرین اورانصار میں ایک عہد باندھا گیا اورایک مسجد تعمیر کی گئی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہجرت سے پیشتر تیرہ سال کے عرصہ میں کیسے تھوڑے سے لوگ حضرت محمد پر ایمان لائے تھے لیکن برعکس اس کے اب اس قدر جلدی جلدی لوگ مسلمان ہونے لگے کہ ہجرت کے آٹھویں سال میں جب حضرت محمد نے مکہ پر لشکر کشی کی تو دس ہزار مسلمان آنحضرت کے ساتھ[2] تھے اور ۹ ہجری میں جنگ تبوک کے وقت تیس ہزار تھے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد جب حضرت ابوبکر نے تسخیر سیریا کے لئے فوج بھیجی توکاتب الواقدی کے بیان کے مطابق ایسی بے شمار تھی کہ اس سے وہ تمام ملک بھر گیا[3]۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان لوگوں میں سے زیادہ تر اسلامی بہشت کی عیش وعشرت سے بھی بڑھ کر اس دنیا کے نفع کے خیال سے جوش میں آگئے تھے۔ ہم دیکھینگے کہ اور بہت سے لوگوں کی طرح خلیفہ المامون کی بھی یہی رای تھی ۔ لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جومجبوراً اوراپنی جان بچانے کے لئے مسلمان ہونے کا

[1] جلد اول صفحہ اول ۱۷۷ ۔

[2] ابن اثیر جلد سوم صفحہ ۹۳

[3] فتوح الشام جلد اول صفحہ ٦ فنظر الیھم قد ملو الارض رفتوح الشام مطبوعہ صفدری مطبع بمبئی ۱۲۹۸ ہجری۔

اقرار کرتے تھے۔ مثلاً بہت سے یہودی جومدینہ کے قرب وجوار میں رہتے تھے مسلمان ہوگئے لیکن ابن اسحاق[4] کہتا ہے "انہوں نے اسلام کی ظاہری صورت اختیار کرلی تھی اورانہوں نے قتل سے بچنے کے لئے بظاہر اسلام قبول کیا تھا"۔ وہ ایسے بہت سے مسلمانوں[5] کے نام بھی بتاتا ہے ۔ بنی النضیر وبنی قینقاع وبنی قریظہ وغیرہ ان کے بھائی بندوں کو جوانجام ہوا تھا اس کو دیکھ کر ان کے خوف زدہ ہونے کے معقول اسباب ثابت ہوتے ہیں۔

لیکن یہ فقط یہودی ہی نہ تھے جن کو اسلام یا دردناک موت پسند کرنا تھا۔ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد قریش میں سے بہتوں نے محمدی تلواروں کے غلبہ کو تسلیم کرلیا اور نتیجتہً مسلمان[6] ہوگئے ۔ابوسفیان کے مسلمان ہونے کا بیان یوں مرقوم ہے کہ فتح مکہ سے پیشتر جب وہ قید ہو کر حضرت محمد کے سامنے پہنچا تو آنحضرت نے اس سے پوچھا کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟ یہ تو ابوسفیان نے مان لیا لیکن جب آنحضرت نے پوچھا کہ کیا تو محمد کو خدا کا نبی مانتا ہے ؟ تو اس نے بڑے ادب سے عرض کی کہ اس کے بارے میں اب تک میرے شکوک باقی ہیں۔ اس پر عباس نے اس سے کہا " تجھ پر افسوس ! اس سے پیشتر کہ تیرا سر کاٹا جائے مسلمان ہوجا اور یہ شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد رسول اللہ ہے"۔ اس نہایت مضبوط اور منطقی دلیل سے قائل ہو کر ابوسفیان فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ اس کے

[4] سیرۃ الرسول جلد اول صفحہ ۱۸۳ فظھر وا با الاسلام واتخدہ جنۃ من القتل۔

[5] سیرۃ الرسول جلد اول صفحہ ۱۸۸ ۔

[6] ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۹۳۔

ساتھ اسی دلیل سے اس کے دو بدحال ساتھی حکیم ابن خرام اور بدیل ابن ورقہ بھی اسلام میں داخل ہوئے۔

ابن اثیر[1] بیان کرتا ہے کہ بخیر نامی جس نے حضرت محمد کی کچھ ہجو کی تھی آخر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اس کے بھائی کعب ابن جبیر نے یہ سن کر حضرت محمد کی ہجو میں کچھ اشعار کہے ۔اس سے آنحضرت نے برا فروختہ ہو کر فرمایا کہ کعب کا خون مباح ہے۔ تب بجیر نے اپنے بھائی کو خط لکھا اور سمجھایا کہ فوراً آکر مسلمان ہوجاؤ ورنہ آنحضرت تم کو ضرور مرواڈالینگے۔ کعب نے فوراً اس نصیحت پر عمل کیا اور اپنی جان بچائی۔ مثل سچ ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا؟

علاوہ بریں بہت سے لوگ ادنیٰ درجہ کی اغراض سے حضرت محمد پر ایمان لائے۔ اس کی مثال کے طور پر الواقدی[2] کے بیان میں ذیل کی کہانی مندرج ہے" رسول اللہ نے فرمایا کہ میں مردوں کو ترغیب وتحریص کے وسیلہ سے جہاد پر آمادہ کرسکتاہوں۔ کہا آؤ میرے ساتھ سیریا پر چڑھ چلو۔ شاید تم کو وہاں الاصفر کی بیٹیاں مل جائیں۔ وہ خیال کرتے تھے کہ الاصفران کو لون میں سے ایک تھا۔۔۔ وہ ملک روم میں گم ہو گیا تھا اور وہاں کی عورتوں سے اس نے شادیاں کی تھیں اور اس کی اولاد کے مردو زن بے نظیر اور خوبصورتی میں ضرب المثل تھے۔ اور جب رسول اللہ نے ان سے الاصفر کی بیٹیوں کا ذکر کیا تو انصار میں سے ایک شخص جدا بن قیس کھڑا ہو کر کہنے لگا یارسول اللہ آپ انصار کو جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میں عورتوں کا کیسا مداح ہوں۔ مجھے اندیشہ

[1] جلد دوم صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵۔

[2] المغازی صفحہ ۱۴۴ جس میں تبوک پر چڑھائی کی طرف اشارہ ہے۔

ہے کہ اگر میں آپ کے ساتھ چڑھائی کروں اور الاصفر کی بیٹیوں کو دیکھوں تو وہ مجھ کو گمراہ کردینگی۔ لہذا مجھے یہیں رہنے دیجئے اور ساتھ لیجا کر گمراہ نہ کیجئے۔

جیسی اس موقع پر حضرت محمد نے ترغیب وتحریص دلائی بالکل ایسی ہی المامون کے عہدِ حکومت میں عبداللہ الھاشمی نےالکندی مسیحی کو ایک خط میں لکھی اوراسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ اس خط میں کسی روحانی نعمت کا ذکر نہیں کرتا بلکہ بہشت کی جسمانی لذات کا بیان کرتا ہے اور ان سب اچھی چیزوں کو پیش کرتا ہے جو اسلام نے دونوں جہان کے لئے پیش کی ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں چار بیویاں اوران کے علاوہ لونڈیاں رکھنے کا ذکر کرتاہے اوران دلائل سے اپنے دوست کو" اس[3] قائم وآسان دین" میں داخل ہونے کے لئے بلاتا ہے۔

مسلمان ہونے کے لئے ایک اورلالچ مالِ غنیمت کی امید تھی۔ جنہوں نے اس غرض سے حضرت محمد کے جھنڈے تلے لڑنا شروع کیا وہ مایوس نہ ہوئے اور اگرچہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے تو بھی ہم اس کی چند مثالیں پیش کرینگے۔" مہاجرین میں سے ایک عبدالرحمٰن جس کا ہم پہلے بھی ذکر کرچکے ہیں نہایت افلاس کی حالت میں مدینہ پہنچا لیکن جب مرا تو سونے کا ایک انبار چھوڑ کر مرا جس کو کلہاڑوں سے کاٹتے کاٹتے لوگوں کے ہاتھ بھی زخمی ہوگئے ۔علاوہ بریں ایک ہزار اونٹ اور بہت سے دیگر جانوروں اور بھیڑوں کے گلے تھے ۔ جنگ ِ نہاوند کے بعد جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا وہ اس قدر تھا کہ اللہ

[3] ھذا الذین القیم السحل۔ رسالہ عبداللہ وغیرہ صفحہ ۱۲ سے ۲۲ تک مطبوعہ لندن ۱۸۸۰ء

اوراس کے رسول کے لئے پانچواں حصہ نکال کر باقی میں سے مسلمان سواروں میں سے ہر ایک چھ ہزار درہم[1] اور پیادوں میں سے ہر ایک کو دوہزار درہم ملا۔

ایامِ ہجرت سے وفات تک حضرت محمد کا بہت سا وقت اپنے تابعین کو دولتمند بنانے کے لئے لوٹ مار کی تدابیر اورحملوں میں خرچ ہوتا تھا۔ الواقدی کا بیاں ہے کہ آنحضرت ۲۶ یا ۲۷ میں سے ۱۹ دھاووں(غزوات) میں بذاتِ خود شریک تھے۔ ابن اثیر ایسے حملوں کی تعداد ۳۵ بیان کرتا ہے اور بعض ان کا شمار ۴۸ بتاتے ہیں۔ ابن ہشام کل تعداد ۲۷ [2] بتا ہے اور غالباً یہی درست ہے۔ الکندی بیان کرتا ہے کہ حضرت محمد خود[3] بنفسِ نفیس ایسے نو حملوں میں لڑے اور چند شب آہنگیوں کے علاوہ ۲۶ میں حاضر تھے۔ ہم حضرت محمد کے چال چلن کے اس پہلو پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے لیکن جو الکندی[4] اس کے متعلق کہتا ہے اسی کو پیش کرنے پر اکتفا کرینگے ۔ جس غرض ومقصد سے مذکورہ بالا ایام میں اور بعد ازاں اسلام پھیلا گیا اس کے اظہار کے لئے خلیفہ المامون کی ذیل کی تقریر کو نقل کرنا کافی ہوگا ۔ چنانچہ وہ ایک موضوع پر یوں کہتا[5] ہے" بیشک میں جانتا ہوں کہ فلاں فلاں ----فقط اسلام کی ظاہری صورت رکھتے ہیں حالانکہ ان میں اسلام کا نام ونشان بھی نہیں اور وہ مجھ پر نظر کرتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ ان کا باطن ان کے ظاہر کا بالکل مخالف ہے----۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو ہمارے دین کی طرف راغب ومائل

---

[1] روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۵۳۔

[2] ابن ہشام جلد سوم صفحہ ۷۸۔

[3] رسالہ عبداللہ وغیرہ صفحہ ۴۷۔

[4] صفحہ ۴۳ سے ۴۷ تک۔

[5] صفحہ ۶۶، ۶۷

ہونے کے سبب سے مسلمان نہیں ہوئے بلکہ بخلاف اس کے وہ ہماری سلطنت میں ہماری نزدیکی اور عزت کے طالب ہیں ۔ جس میں وہ داخل ہوئے ہیں ان کی اس کی صحت ودرستی کا کچھ علم نہیں ہے اور وہ اس کی طرف راغب بھی نہیں ہیں اور یقیناً میں جانتا ہوں کہ ان کا حال اس حکایت کی مانند ہے جس کو عام لوگوں نے ضرب المثل بنارکھا ہے یعنی اگر یہودی کی پوچھو تووہ یہودی ہی ہے۔ توریت پر تو عمل کرتا ہے اوراسلام کا اقرار کرتا ہے اور یہ جو مجوسی مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں کہ ان کا کیا حال ہے ؟ یہ بھی یہودی کی مانند ہیں اور یقیناً میں جانتاہوں فلاں وفلاں---۔ مسیحی تھے اوراپنی مرضی کے خلاف مسلمان ہوئے ۔ وہ نہ مسلمان ہیں نہ مسیحی لیکن دونوں کا مرکب ۔ پس میری تدبیر کیا ہے اورمیں کیا عمل کروں ؟ ان سب پر خدا کی لعنت ہوا --۔لیکن رسول اللہ میرے لئے نمونہ اور تسلی کا باعث ہیں۔ اسکے اصحابہ میں سے بہترے جواس سے بہت قربت رکھتے تھے اوربہت اچھے سمجھے جاتے تھے اس کے تابعین اورمددگار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اوروہ جانتا تھا کہ وہ ریاکار ومنافق تھے اورجیسے اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہرگز فی الحقیقت ویسے نہیں تھے اوریہ اس پر خوب روشن تھا اوروہ ہمیشہ اس کے بدخواہ تھے ۔ اس کے لئے برائی چاہتے تھے اوراس کے گرنے کےآرزومند رہتے تھے اور اس کے خلاف مشرکوں کی مدد کرنا چاہتے تھے ---۔پھر اس کی موت کے بعد وہ سب برگشتہ ہوگئے اوران میں سے ایک بھی ایسا خیال نہیں کرتا تھا کہ اس میں (محمد میں ) درست ہدایت تھی ۔ وہ سب پھر گئے اوراسلام کی بربادی کےخواہاں بن گئے اور ظاہر وباطن میں خفیہ وعلانیہ ہر طرح سے اسلام کی بربادی کے آرزومند تھے۔ یہاں تک کہ

خدا کی مدد آئی اور شکستگی کو بستہ کیا اوران میں سے بعض کے دل میں خلافت کی آرزو اور دنیا کی محبت ڈال دی۔

حضرت محمد کی وفات کے بعد اقوام کے پھر جانے کو مورخین اسلام نے دین سے برگشتگی لکھا ہے۔ لہذا یہ محض زکواۃ دینے سے انکار کرنے کا معاملہ نہیں تھا بلکہ اسلامی احکام اور شریعت قرآن کی سخت خلاف ورزی تھی مثلاً ابن اثیر یوں لکھتا ہے "اہل عرب[1] برگشتہ ہوگئے (ارتدت العرب)۔ ہر قوم کے رذیل وشریف اورانکا نفاق واضح ہوگیا اور وہ خوش تھے۔یہود ونصاریٰ نے (اطاعت سے) انکار کیا اورمسلمان ایسے ہوگئے جیسے برسات کی رات میں بھیڑیں کیونکہ ان کا نبی جاتا رہا اور وہ بہت تھوڑے تھے اوران کے دشمن بہت تھے"۔ حالت ایسی نازک تھی کہ حضرت ابوبکر کو بار بار یہ ترغیب دی گئی جو فوج تسخیر سیریا کے لئے اسامہ بن زید کے زیر فرمان مدینہ کے پاس جمع تھی اس کو روک لے۔ لیکن اس نے ایسا کرکے حضرت محمد کی آخری آرزو کی خلاف ورزی کرنے سے انکار کیا۔ حضرت ابوبکر نے ان اقوام کو مطیع بنایا اور وعدہ[2] وعید کے وسیلہ سے السیوطی نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے چنانچہ وہ یوں لکھتا ہے لما[3] ارتدت العرب جاھد ھم ابوبکر واصحابہ حتیٰ ردھم الی الاسلام یعنی جب ہل عرب برگشتہ ہوگئے توابوبکر اوراس کے اصحاب نے ان سے جہاد کیا یہاں تک کہ ان کو اسلام کی طرف واپس لے آئے۔

---

[1] ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۱۲۷ نیز دیکھو الکندی صفحہ ۶۵، ۶۶، اور روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۲۲۴ سے ۲۳۱ تک۔

[2] روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۲۳۱۔

[3] تاریخ الخلفا صفحہ ۴۴ محمدی مطبع لاہور ۱۲۷۴ ہجری ۔ اسی کتاب کے صفحہ ۵۱، ۵۲ پر زیادہ مفصل بیان مرقوم

اب حدود عرب سے باہر اسلام کی اشاعت شروع ہوئی ۔ ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ یہ کیونکر اور کس کے حکم سے ہوا اور کن وسائل ودلائل سے لوگوں کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ حضرت محمد رسول اللہ اور خاتم النبین تھے اور کس روح اور طبعیت کے ساتھ دنیا کو مسلمان بنانے کا کام شروع ہوا اور کن دلائل وبراہین کے ذریعہ سے سیریا ومصر وفارس کے بہت سے لوگوں نے اس سے دین کو قبول کرلیا؟

حضرت محمد کی وفات حسرت آیات کے بعد سیریا کی طرف فوج روانہ کرتے وقت حضرت ابوبکر نے یوں فرمایا تھا" یاد رکھو کہ رسول اللہ نے اپنی فوج سیریا کو بھیجنے کا پختہ ارادہ کیا تھا اوراس کو خدا نے اپنے پاس بلایا۔۔۔ اور میں یقیناً مسلمان بہادروں کے منہ سیریا کی طرف کیا چاہتا ہوں ۔۔۔۔ کیونکہ رسول اللہ نے اپنی وفات سے پیشتر مجھ کو یہ حکم دیا تھا اورکہا تھا کہ زمین خدا نے مجھ کودے دی ہے لہذا میں نے اس کے مشرقی اور مغربی حصے دیکھ لئے ہیں اور اس سے جو کچھ خدا نے مجھے دیدیا ہے وہ میرے لوگوں کے قبضہ میں آجائیگا"۔ علاوہ بریں ابوبکر نے ایک خط لکھا اوراسکی ایک ایک نقل مکہ اور یمامہ بھیجی اور لوگوں کو اس جہاد میں شریک ہونے کی ترغیب دی۔ یہ نام (جہاد) کاتب الواقدی نے بار بار لڑائی کے لئے استعمال کیا ہے اور حضرت عمر کا خط جوانہو ں نے عبیدہ کو لکھا اوراس مصنف کی تصنیف فتوح العجم میں صفحہ ۲ پر منقول ہے اس میں بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

جو فوج یزید ابن ابی سفیان کے زیر فرمان سیریا کو روانہ ہوئی ۔ اس کو حضرت ابوبکر نے وہ ہدایت دی جو ہم اس رسالہ کے تیسرے حصہ کے دوسرے باب میں درج کرچکے ہیں۔ یہ بہت کچھ اسی کی مانند ہے جو حضرت

محمد نے تبوک پر لشکر کشی کرنے سے پیشتر اپنے متنبیٰ زید ابن حارث کو ایک لشکر کے ساتھ اسی قسم کے دھاوے پر بھیجتے وقت فرمایا تھا"۔ سیریا[1] میں جو تمہارے اور خدا کے دشمن ہیں ان کو قتل کرنا۔ وہاں تم کو ایک قسم کے لوگ ملینگے جو گوشہ ہای تنہائی میں رہتے ہیں۔ ان کو کچھ آزار نہ پہنچانا اور عورتوں اور لڑکوں اور شیر خوار بچوں کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درختوں کو مت کاٹنا اور گھروں کو برباد مت کرنا"۔ لیکن کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں عورتوں پر کسی طرح کا رحم تھا کیونکہ اکثر اوقات وہ موت سے بھی بہت بد تر مصیبت کے لئے رکھی جاتی تھیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مکہ ومدینہ ہر دو مقام میں حضرت محمد نے ان عورتوں کو قتل کروایا جن سے آنحضرت کسی طرح ناراض ہوگئے تھے۔ پھر آنحضرت کی وفات کے بعد مسلمان بھی عورتوں پر زیادہ رحیم ثابت نہیں ہوئے۔ السیوطی[2] ہم کو دو عورتوں کا حال بتاتا ہے کہ انہوں نے کیسی اذیت برداشت کی۔ ان میں سے ایک نے حضرت محمد کی ہجو کی تھی اور دوسری نے مسلمانوں کو برا کہا تھا۔ ان دونوں کے سر کاٹ کر سامنے کا ایک ایک دانت نکال دیا تھا۔ حضرت ابوبکر نے یہ سن کر لکھا کہ اگر اس سے مشورۃ کی جاتی تو وہ ان میں سے پہلی کو قتل کرنے کا حکم دیتا۔

جس روح وطبعیت کے ساتھ قرب وجوار کے ممالک کو مسلمان بنانے کا کام شروع کیا گیا تھا اس کا نہایت واضح اور صاف اظہار حضرت علی ابن ابی طالب کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے۔

[1] روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۶۴ ۔ دیکھو مکاشفات ۹: ۴۔

[2] تاریخ الخلفا صفحہ ۶۷ ۔

السیف[3] والخنجر ریحاننا اف علی النرجس والاآس

شرابنادم اعدئنا کاسنا جمجمۃ الراس

یعنی ہماری تلواریں اور ہمارے خنجر ہمارے لئے گل وریحان ہیں۔ نرگس وآس کی ہمیں ذرا بھی پروا نہیں۔ ہمارے دشمنوں کا خون ہماری شراب ہے اور ان کے سروں کی کھوپڑیاں ہمارے پیالے ہیں۔

دشمنوں کو قتل کرنا بالکل قرآن کی تعلیم کے موافق ومطابق ہے کیونکہ سورۃ مائدہ کی ۳۷ویں آیت میں صاف مرقوم ہے إِنَّمَا جَزَاء الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُواْ أَوْ يُصَلَّبُواْ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلافٍ أَوْ يُنفَوْاْ مِنَ الأَرْضِ یعنی یہی سزا ہے ان کی جو لڑائی کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے۔ دوڑتے ہیں ملک میں فساد کرنے کو کہ قتل کئے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا ان کے مقابل کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں یا جلاوطن کردئے جائیں۔ پھر سورہ توبہ میں اس آیت کی تعمیل پائی جاتی ہے۔ ۱۱ ہجری کے چار مقدس مہینوں کے گذرنے کے بعد مسلمانوں کو مشرکوں کے ساتھ کسی عہد وپیمان پر قائم رہنا ضروری نہ رہا۔ چنانچہ سورہ توبہ کی پہلی چار آیت میں صاف لکھا ہے۔ پھر پانچویں آیت میں یوں مرقوم ہے فَإِذَا انسَلَخَ الأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُواْ الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُواْ لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ یعنی پھر جب پناہ کے مہینے گذر جائیں تو مارو مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی تاک میں۔ فقط زکواۃ دینے اور نماز

[3] دیوان علی ابن ابی طالب صفحہ ۵۳

پڑھنے اور توبہ کرنے یعنی مسلمان ہونے ہی سے ان کی جان بخشی ہوسکتی تھی۔اہل الکتب کے حق میں اسی سورۃ کی ۲۹ ویں آیت میں فیصلہ کیا گیا ہے کیونکہ مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے قَاتِلُواْ الَّذِينَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّهُ وَرَسُولُهُ وَلاَ يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُواْ الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ یعنی لڑو ان لوگوں سے جو یقین نہیں رکھتے اللہ پر نہ پچھلے دن پر۔ نہ حرام جانتے ہیں جو حرام کیا اللہ نے اوراس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا۔ وہ جو کتاب والے ہیں جب تک دیویں جزیہ وہ سب ایک ہاتھ سے اور بے قدر ہوں۔ یہ حکم اب تک مسلمانوں کے لئے واجب التعمیل ہے۔ ان کا فرض کلی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو یا تو مسلمان بنائیں یا ایسی حالت میں پہنچائیں جو غلامی کی حالت سے بھی بد تر ہے۔ اب ہم یہ ظاہر کرینگے کہ قدیم زمانہ کے مسلمانوں نے اس فرض کو ایسا ہی سمجھا اوراسی واسطے سیریا و فلسطین ومصر وفارس اور دیگر ممالک کو فتح کیا۔ بیشک ایسی فتوحات میں شریک ومشغول ہونے سے ان میں سے بہتوں کا مقصد مالِ غنیمت اور لونڈیوں کا حصول تھا لیکن ان کے دین نے یہ سب کچھ جائز ٹھہرایا اوراسکی ترغیب دی۔ لہذا ہر ایک لڑائی کا مقصد اشاعت اسلام بیان کیا جاتا تھا اوراس کو جہاد کے نام سے نامزد کرتے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے سیریا پر لشکر کشی کو جہاد کہا تھا اور حضرت عمر نے جب عیاذ ابن الغنم کو وہ خط لکھا جس میں اسے دیار بکر اور ربیعہ فارس کی تسخیر کے لئے لشکر کشی کا حکم دیا تو انہوں نے بھی اس لڑائی کے لئے لفظ جہاد ہی استعمال کیا۔مورخین صاف طور سے ان فتوحات کے متعلق تمام لڑائیوں کو جہاد ہی کے نام سے نامزد کرتے ہیں اور مذکورہ بالا ممالک کے باشندوں سے شرائط صلح جو مسلمان سپہ سالاروں نے طلب کیں وہی ہیں جو سورۃ توبہ کی آیت مندرجہ بالا میں مرقوم ہیں۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے چند مثالیں پیش کرنا کافی ہوگا۔

جب اسلامی لشکر نے یروشلیم کا محاصرہ کیا تو وہاں کے باشندوں کو ابوعبیدہ نے یوں لکھا" اگر تم ہمارے[1] دین کے مطابق چلو یا جزیہ دینا منظور کرو تو میں تمہارے دامنِ عزت سے دست مداخلت کو اٹھالونگا لیکن اگر تم ایسا نہ کرو تو میں تم پر ایسے لوگوں کو مقرر کرونگا جن کے نزدیک اپنے دین کے لئے قتل ہونا اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ تمہارے نزدیک لحم الخنزیر اور شراب کو کھانا پینا ہے"۔ کاتب الواقدی[2] لکھتا ہے کہ اسی طرح سے اہل یروشلیم کے پاس یزید پیغام مندرجہ ذیل کے ساتھ بھیجا گیا تھا" ۔ اسلام اور حق اور سادگی کے عقیدوں کی طرف دعوت کے جواب میں تم کیا کہتے ہو؟ اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ لا الہ الااللہ محمد رسول اللہ تاکہ ہمارا خدا تم کو تمہارے وہ گناہ جو تم سے ہوچکے بخش دے اور تم قتل ہونے سے بچ جاؤ اگر تم انکار کرتے ہو اورہماری بات کو نہیں مانتے تو اپنے شہر کی سلامتی کے لئے عہدوپیمان کروجیسا کہ اوروں نے کیا ہے جو شمار میں تم سے زیادہ اور طاقت میں بڑھ کر تھے اور اگر تم یہ دونوں باتیں نا منظور کرتے ہو تو تم برباد ہوجاؤ گے اور آتش دوزخ میں پڑوگے"! ترجمان نے نہایت سادہ طور سے اور درستی کے ساتھ یوں مطلب بیان کیا" یہ سردار یہ باتیں کہتا ہے اور تم کو ان تین باتوں میں سے ایک کو منظور کرنے کی طرف بلاتا ہے:(۱۔) یا مسلمان ہوجاؤ۔(۲۔) یا جزیہ دو(۳۔) یا قتل کئے جاؤ"

---

[1] روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۲۱۴۔

[2] فتوح الشام جلد اول صفحہ ۳۴۰ مطبوعہ صفدری طبع بمبئی ۱۲۹۸ ہجری۔

مسیحیوں نے یہ جواب دیا" ہم اپنے جلالی اورمقبول دین سے نہیں پھرینگے اوراگرہم قتل کئے جائیں تو یہ ہمارے لئے اپنے دین سے دست بردار ہونے سے آسمان ہوگا"۔

پھر اسی طرح سے آرمینیا پر لشکر کشی کے بیان کے شروع میں کاتب الواقدی[1] لکھتاہے کہ اہلِ عرب نے یدلس کے آرمنی حاکم بوسیوس کے پاس یہ پیغام بھیجا"۔ ہم ایلچی تمہارے پاس یہ کہنے کو بھیجے گئے ہیں کہ یا تو تم اس بات پر شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد اس کا بندہ اور رسول ہے یا تم بھی اس میں داخل ہو جس میں اور لوگ داخل ہوئے ہیں اور جزیہ دو اور بے قدر ہو"۔

جب سعد ابن ابی وقاص نے مغیرہ ابن شیبہ کو یزدجرد کے دربار میں مدائن بھیجا تو وہ پیغام جو اس نے خلیفہ کی طرف سے پہنچایا اور جس سے شاہِ فارس حیران ہوگیا یہ تھا"ہم[2] تجھ کو غیر فانی شریعت قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر تو قبول کرے تو کوئی تیری سلطنت میں بے اجازت قدم نہیں رکھیگااور زکواۃ[3] وپنجم کے سوا ایک پیسہ بھی تجھ سے طلب نہیں کیا جائیگا اوراگر خدا کا فضل تیری یاوری[4] نہ کرے تو جزیہ ادا کیا کرورنہ لڑائی کے لئے تیار ہوجا"۔ اسی مورخ نے ایک اور بیان یوں لکھاہے "اگر تو مسلمان ہونے اور زکواۃ وپنجم دینے سے انکار کرتا ہے تو جزیہ دیا کراور اس حالت میں تو صاغر ہوگا"۔

[1] فتوح العجم صفحہ ٦٢ مطبوعہ ٦٢ مطبوعہ کانپور ١٢٨٧ ہجری۔

[2] روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ٢٦٤۔

[3] جوکہ ہر ایک مسلمان صاحب نصاب پرواجب الادا ہے۔

[4] یعنی اگر تو مسلمان نہ ہوجائے۔

یزدجرنے صاغر[5] کا مطلب پوچھا۔ مغیرہ نے جواب دیا" صاغر سے یہ مراد ہے کہ جب تو جزیہ ادا کریگا تو کھڑا رہیگا اور ہر ایک کوڑا تیرے سر پر جھومتا رہیگا"۔

قریباً اسی طرح کا ایک اور بیان ہے کاتب الواقدی بیان کرتا ہے کہ قادسیہ کی لڑائی سے پیشتر سعد ابن ابی وقاص نے ابو موسیٰ کو فارسی سپہ سالار رستم کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا" ہم تم کو شہادت دینے کے لئے بلاتے ہیں۔ اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے ہو تو جزیہ دو۔ اگر تم (اس سے بھی) انکار کرتے ہو تو تلوار بہت قابل اعتماد گواہ ہے"۔

اظہر من الشمس ہے کہ مسیحیوں اور زرتشتیوں کو اس طرح سے (١۔) اپنی مرضی کے خلاف مسلمان ہونے (٢)۔ جزیہ دینے اور بے قدر ہونے اور (٣) قتل کئے جانے میں سے کسی ایک بات کو منظور کرنے کے لئے مجبور کرنے میں عربی سپہ سالار قرآن کی فرمانبرداری کررہے تھے (سورہ توبہ ٢٩ ویں آیت)۔ بیشک وہ زرتشتیوں کے ساتھ اور بھی بد تر سخت تر برتاؤ کرسکتے تھے(سورہ توبہ پانچویں آیت )اگر وہ ان کو اہلِ کتاب نہ سمجھتے اگرچہ ۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اہل الکتب کا لقب فقط یہود و نصاریٰ ہی سے علاقہ رکھتاہے۔

پس جب وقتاً فوقتاً لوگوں کو اس طرح سے بزور شمشیر اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا توجب کبھی انہوں نے اپنے آپ کو اسلام کی تردید کے قابل سمجھا اسے فوراً رد کردیا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ٣٠ ہجری میں حضرت عثمان نے عثمان ابن ابی العاص یا اپنے بھائی سعد کو (کیونکہ بیانات مختلف ہیں) یزدجرد کے خلاف بھیجا جو کہ اہل استخر کی مدد کو بڑھا چلاآرہا تھا جن کے بارے

[5] بے قدو ذلیل۔

میں مرقوم ہے کہ پہلے انہوں نے سردارانِ اسلام کی اطاعت[1] قبول کرلی تھی اوراب پھر صراط مستقیم سے منحرف ہوگئے تھے۔

لیکن جب ثابت ہوجائے کہ اسلام خدا کی طرف سے نہیں ہے تواس سےدست بردار ہونا نہایت پر خطر[2] ہے اوراگر کوئی آدمی بظاہر اسلام قبول کرے لیکن دل سے اس پر ایمان نہ لائے تووہ ریاکار ومنافق ہے اور قرآن کی تعلیم کے مطابق ریاکار ومنافق جہنم کے سب سے نچلے[3] طبقہ میں ہونگے توبھی ابتدایِ اسلام میں اہل اسلام کا خاص فرض یہ تھا کہ لوگوں کو بزورِ شمشیر مسلمان ہونے پر مجبور کریں یعنی ان کو ریاکارومنافق بنائیں۔علاوہ بریں مسلمان بنانے کے لئے دنیاوی لالچ بھی پیش کئے جاتے تھے ۔ پس ان طریقوں سے اسلام کی اشاعت ہوئی ۔ پھر جہالت ونادانی لوگوں کے ایمان کی محافظ بنائی گئی تھی۔ چنانچہ مفتوحہ ممالک کے کتب خانوں کے باب میں حضرت عمر نے جوحکم صادر فرمایا تھا اس سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہوجاتی ہے۔ سکندریہ کے عظیم الشان کتب خانہ کے بارے میں ابوالفرج بیان کرتاہے کہ ۶۴۰ء میں عمروابن العاص نے مصر کو فتح کیا تو حضرت عمر سے پوچھا گیا کہ کتب خانہ محفوظ رکھا جائے یا نہ رکھا جائے۔ اس نے یوں جواب دیا"اگر یہ یونانی مصنفین کی تصانیف خدا کی کتاب (قرآن) سے مطابقت رکھتی ہیں تو بیفائدہ ہیں اور ان کو باقی رکھنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اگر یہ اس سے مخالفت رکھتی ہیں توزبون ومضر ہیں اوران کو

[1] روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۲۵۸۔

[2] ابن ہشام جلد دوم صفحہ ۲۱۷ پرایک آدمی کا حال مرقوم ہے جس پر اسلام سے دست بردار ہونے کے سبب سے موت کا فتویٰ دیا گیا تھا۔

[3] سورۃ النسا آیت ۱۴۴۔

نیست کرنا واجب ہے۔ پھر اسی طرح سے کشف الظنون میں مرقوم ہے کہ جب سعد ابن ابی وقاص نے فارس فتح کیا تو حضرت عمر کولکھ کر دریافت کیا کہ فارسی کتب خانوں سے کیا کیا جائے ۔ حضرت عمر کا جواب یہ تھا" ان کو دریا میں پھینک دو کیونکہ اگران کتابوں میں ہدایت ہے توہمارے پاس کتاب اللہ اس سے بڑی ہدایت موجود ہے۔ اگر بخلاف اس کے ان میں گمراہ کرنیوالی باتیں ہیں توخدا ہم کوان سے بچائے"۔ مذکورہ بالادونوں موقعوں پر حکم کی تعمیل کی گئی ۔ فقط معتزلوں کے ایام میں ہی کسی اسلامی ملک میں کسی قدر آزادانہ خیال کرنے کی اجازت ہوئی ہوگی۔

فارس میں جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا ان پر بہت ظلم وستم کیا گیا اوراس سے تنگ آکر بہت سے زرتشتی ہندوستان کو بھاگ گئے جہاں ان کی اولاد سے بمبئی میں ایک بڑی بھاری اوراقبالمند تجارت پیشہ جماعت ہے۔ انہوں نے اپنے ملک میں رہے کر اہلِ اسلام کے ظلم وستم اور بے عزتی برداشت کرنے سے بت پرست ہندوؤں کے درمیان رہنا بہتر جانا۔ جو لوگ اسلامی ممالک میں رہتے ہیں اور جنہوں نے وہاں سفر کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ وہاں پر یہود ونصاریٰ اور زرتشتی ذمیوں کی کیسی بُری حالت ہے۔ یہاں تک کہ وہ عدالت میں جاکر گواہی بھی نہیں دے سکتے ۔ وہ ظلم وتشدد کے مقابلہ میں اپنی حفاظت نہیں کرسکتے اورہر وقت مسلمانوں سے قتل کئے جانے کے خطرہ میں رہتے ہیں جیسا کہ ابھی چند ہی سال گذرے ہیں ادانہ و آرمینیا وبلگیریا میں ہوا۔ زمانہ دراز تک یہ ہوتا رہا کہ مسیحیوں کے بچے زبردستی چھین لئے جاتے تھے اور جبراً مسلمان بنائے جاتے تھے اوران کو مجبوراً سپاہ میں بھرتی ہونا پڑتا تھا تاوقتیکہ ایک روز سلطان کے حکم سے ایسی تمام سپاہ موقوف کردی گئی۔

جب ان اوراق کا مولف فارس میں اصفہان کے نزدیک رہتا تھا تو اس کا ایک مسلمان جان پہچان تھا جو پاس ہی کے ایک گاؤں کا باشندہ تھا۔ اس فارسی نے ایک دن اپنا حال یوں بیان کیا"۔ قریباً پچاس سال کا عرصہ ہوا ہو گا جب میں چھوٹا لڑکا تھا۔ میں اور میرے والدین اور ہمارے گاؤں کے سب لوگ زرتشتی تھے۔ ایک دن شہر اصفہان کے بڑے مجتہد نے فتویٰ جاری کیا اور ہم سب کو مسلمان ہونے کا حکم دیا۔ ہم نے اپنے صوبہ کے حکمران شہزادہ کے حضور میں فریاد کی ۔ ہم نے اپنے دین سے دست بردار ہونے سے انکار کیا اور ہم نے سرکردہ مسلمان امراوعلما کو رشوت دی۔ انہوں نے ہم سے روپیہ لے لیا لیکن ہماری کچھ مدد نہ کی ۔مجتہد نے ہم کو آئندہ جمعہ کی دوپہر تک مسلمان ہوجانے کی مہلت دی اور کہا کہ اگر تم اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے توسب کے سب قتل کئے جاؤ گے۔ اس صبح شہر کے سب بدمعاشوں نے آکر ہمارے گاؤں کو گھیر لیا ۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی خونریز ہتھیار تھا اور ہر ایک غارت وقتل کے لئے وقت مقررہ کا منتظر تھا۔ ہم قریباً دوپہر تک بے فائدہ انتظار کرتے رہے کہ شاید ہمارے دشمن کا دل نرم ہوجائے لیکن وہ نرم نہ ہوا اور عین وقت سے تھوڑی دیر پیشتر سب نے مسلمان ہو کر اپنی جان بچائی"۔

کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا کہ اس ملک میں یہ قانون جاری تھا کہ اگر کسی مسیحی خاندان سے ایک شخص مسلمان ہوجائے تو خواہ وہ سب سے چھوٹا بیٹا ہی ہو اس خاندان کی تمام جائداد فوراً اس کے حوالہ کی جاتی تھی اور اس کے والدین اور بھائی بہن سب خالی ہاتھ گھر سے نکال دئے جاتے تھے۔ جب ہم اس ظلم وستم کا خیال کرتے ہیں جو قریباً ۱۳۰۰ سال سے تمام اسلامی ممالک میں مظلوم ذمیوں کا حصہ ہے تو نہایت تعجب کی بات نظر آتی ہے کہ ان میں سے بہتوں نے ریاکار ومنافق بننے کی آزمائشوں اور ہر طرح کے لالچوں کا مقابلہ کیا ہے۔

اب ہم نے خدا کی مرضی کے آخری الہام ہونے کے اسلامی دعویٰ کی تحقیق کو تمام کرلیا ہے۔ جب ہم ان معیاروں کا خیال کرتے ہیں جن کا تمہید میں ذکر ہوا اور یہ دریافت کرتے ہیں کہ کہاں تک اسلام ان سے درست ثابت ہوتا ہے تو اس کا جواب دینا کچھ مشکل نہیں۔ ہمارے خیال میں فقط چوتھا معیار اسلام کی کسی قدر تائید کرتا ہے لیکن بخلاف اس کے مسیحی دین تمام معیاروں سے پورے طور سے درست وحق ثابت ہوتا ہے ۔پس نتیجہ خود ظاہر ہے ۔ عیاں راچہ بیان؟

# آٹھواں باب

## خاتمہ

اب اے معزز پڑھنے والے ! اسلام کی سچائی اور صداقت کے جتنے ثبوت پیش کئے جاتے ہیں ہم نے ان سب کی خوب تحقیق کرلی ہے اور ہم نے حضرت محمد کے اشرف الانبیا اور خاتم النبین ہونے کے دعویٰ کو بھی خوب جانچ لیا ہے۔ اب خدای تعالیٰ کے حضور میں جو بنی آدم کے دلوں سے خوب واقف ہے آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ دعویٰ حق ہے یا باطل - خدایِ رحیم ورحمٰن آپ کو درست فیصلہ کرنے کی توفیق بخشے۔

آپ کو سیدنا مسیح کلمتہ اللہ اور حضرت محمد ابن عبداللہ میں سے ایک کو پسند کرنا ہے۔ یا تو اس کو پسند کرنا ہے جو نیکی کرتا پھرا یا اس کو جو النبی بالسیف کہلاتا ہے۔ یا تو اس کو جس نے فرمایا" اپنے[1] دشمنوں سے محبت رکھو "یا اس کو جس نے کہا" اپنے[2] دشمنوں اور خدا کے دشمنوں کو قتل کرو"۔ یا تو اس کو پسند کرنا ہے جس نے اپنے قتل کرنے والوں کے لئے دعائے[3] خیر کی یا تو اس کو جس نے اپنے ہجو کرنے والوں کو قتل کروایا۔آپ جانتے ہیں کہ سیدنا مسیح کی زندگی کیسی تھی اورا س کا چال چلن کس پایہ کا تھا اورآپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان سے اس کے دعاوی کی صداقت کا نہایت قطعی ثبوت ملتا ہے۔

### آفتاب آمد دلیل آفتاب

### گردلیلت رازوی رومتاب

برعکس اس کے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ مسلمان مصنفین نے اپنی تصانیف میں حضرت محمد کی زندگی اور چال چلن کی کیسی تصویر کھینچی ہے۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کرلیجئے کہ کیا حضرت محمد کی زندگی اور چال چلن سیدنا مسیح کی زندگی اور چال چلن سے بہتر ہے کہ آپ راستی کے ساتھ مسیح کو رد کرکے اپنی ابدی نجات کے لئے حضرت محمد پر تکیہ کرسکتے ہیں؟آپ اس سے خوب آگاہ ہیں کہ بائبل یعنی کلام اللہ سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ مسیح نے پیشینگوئی کے مطابق گنہگاروں کی خاطر اپنی جان دیدی اور ہمارے گناہوں کا کفارہ دیا درحالیکہ حضرت محمد طبعی اور معمولی موت سے مرے اورانہوں نے اوروں کے گناہوں کے لئے مرنے کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ اپنے وعدے اوراپنے شاگردوں کی گواہی کے مطابق سیدنا مسیح تیسرے دن مردوں میں سے جی اٹھا اوراس سے موت پر غالب[4] آنے کا ثبوت دیا۔ قبر اور موت اب تک حضرت محمد پر قابض ہیں۔

مدینہ میں ان قبروں کے درمیان جن میں حضرت محمد وابوبکر مدفون ہیں ایک خالی قبر ہے جس کو مسلمان ہمارے سیدنا مسیح ابن مریم کی قبر کہتے

---

[1] متی ۵: ۲۴

[2] روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۱٦۴

[3] لوقا ۲۳: ۳۴۔

[4] انجیل شریف خط اول تمیتھیس ۱: ۱۰۔

ہیں "۔ اس قبر میں کوئی دفن نہیں کیا گیا اور اس کا خالی ہونا حاجیوں کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ مسیح زندہ [1] ہے حالانکہ حضرت محمد مردہ ہیں۔ دونوں میں سے کون آپ کی مدد کرنے کی زیادہ قابلیت رکھتا ہے؟ آپ کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ حضرت محمد کے لئے دعا کریں لہذا یقیناً آپ کا اعتقاد ہے کہ وہ بخلاف اس کے کہ آپ کی مدد کرسکیں آپ کی دعاؤں کا محتاج ہیں۔ آپ یہ مانتے ہیں کہ سیدنا مسیح دوبارہ آئیگا اور آپ اس کی آمد کا ڈرتے ہوئے انتظار کرتے ہیں۔ ہم بھی خوشی اور امید کے ساتھ اس کی دوسری آمد کا انتظار کرتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اس کا اپنا [2] اور اس کے فرشتوں [3] کا وعدہ پورا ہوگا۔ ہم اس وقت کے نپٹ آرزومند ہیں جب رسول کا یہ قول پورا ہوگا "دیکھو [4] وہ بادلوں کے ساتھ آنے والا ہے اور ہر ایک آنکھ اسے دیکھیگی اور جنہوں نے اسے چھیدا تھا وہ بھی دیکھیں گے اور زمین پر کے سارے قبیلے اس کے سبب سے چھاتی پیٹیں گے "۔ یہی سبب ہے کہ جوں جوں وہ عظیم الشان روز قریب آتا جاتا ہے ہم زیادہ سرگرمی کے ساتھ اس کے آخری حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور تمام مخلوقات کو انجیل سناتے ہیں۔ ہمارا قیام اس زمین پر بہت تھوڑے سے عرصہ کے لئے ہے اور آپ کا بھی شاید مدت دراز کے لئے نہیں ہے۔ لہذا جیسا کہ مرنے والے مرنے والوں کو کھتے ہیں کہ ہم آپ کو پکار کر کھتے ہیں کہ خدای حی القیوم وپاک وعادل ورحمٰن کی طرف رجوع لاؤ۔ ہم آپ سے عرض کرتے ہیں کہ اس جہان کے نور ہو کر اپنے دل کے

---

[1] مکاشفہ ۱: ۱۸۔

[2] یوحنا ۱۴: ۳

[3] اعمال الرسل ۱: ۱۱

[4] مکاشفہ ۱: ۷۔

اندر جگہ دو تاکہ اس زندگی میں نورِ حق میں چلو اور شیطان کے دام فریب سے آزاد ہو اور گناہ کی قید وغلامی سے رہائی حاصل کرو اور آخر کار جب سیدنا مسیح راستی کے ساتھ تمام جہان [5] کی عدالت کرنے کو آئے تو اس کے حضور میں شرمندہ نہ ہو کیونکہ ضرور [6] ہے کہ مسیح کے تخت عدالت کے سامنے جاکر ہم سب کا حال ظاہر کیا جائے اور اس کو "وہ نام [7] بخشا گیا ہے جو سب ناموں سے اعلیٰ ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کے نام پر ہر ایک گھٹنا ٹکے خواہ آسمانیوں کا ہو خواہ زمینیوں کا خواہ ان کا جو زمین کے نیچے ہیں اور خدا باپ کے جلال کے لئے ہر ایک زبان اقرار کرے کہ سیدنا مسیح مولا ہے"۔ کسی نہ کسی روز آپ کو ضرور اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنا ہوگا ۔ ابھی سے کیوں نہ ٹیکیں؟

ہم آپ کو اس کی اس محبت کی خوش خبری سناتے ہیں جس کے سبب سے اس نے آپ کے لئے اپنی جان دی حالانکہ آپ اب تک اس پر ایسا ایمان نہیں رکھتے جیسا کہ وہ [8] لوگ رکھتے ہیں جو اس کے شاگرد بن گئے ہیں۔ وہ اب آپ کو نجات کا انعام [9] مفت دیتا ہے اور ساتھ ہی خدا کی معافی کا یقین اور نئی زندگی میں اس کی عبادت کی توفیق اور آخر کار آسمانی مکانوں [10] میں خدا کی

---

[5] متی ۲۵: ۳۱تا ۴۶

[6] ۲ کرنتھیوں ۵: ۱۰

[7] فلپیوں ۲: ۹تا ۱۱

[8] ۱ کرنتھیوں ۱۵: ۳

[9] رومیوں ٦: ۲۳

[10] یوحنا ۱۴: ۳

قربت میں ایک مکان عنایت کرتا ہے جہاں کوئی ناپاک کرنے والی[1] چیز داخل نہیں ہوسکتی۔

لہذا اے بھائی دعا کیجئے کہ اللہ جل شانہ آپ کو ہدایت کرے اوراس اہم ترین امر میں اس سے پیشتر کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے آپ کودرست فیصلہ پر پہنچادے۔ اس طرح سے آپ حق و باطل اور درست نادرست کی کشمکش کے وقت خدا کی طرف ہونگے۔ اس طرح سے آپ اس کے وسیلہ سے حق کو حاصل کرینگے جو راہ[2] حق اور زندگی ہے اوراس زندگی میں ہر روز اس کے ساتھ ساتھ چل کر اور اپنے دل میں وہ سلامتی اور اطمینان حاصل کرکے جو دنیا نہیں دے سکتی اور موت ودوزخ کے خوف سے آزاد ہو کر آپ نہایت خوشی وشادمانی کے ساتھ پرُجلال قیامت کے منتظر اور امیدوار ہونگے اور جب وہ راستی کے ساتھ جہان کی عدالت کرنے کو پھر آئے گا توآپ اس کے زخمی ہاتھ سے حیاتِ ابدی کا تاج حاصل کریں گے۔آمین ثم آمین۔

---

[1] مکاشفہ ۲۱: ۲۷

[2] یوحنا ۱۴: ۱۔